آنکھ جو سوچتی ہے

(ناول)

کوثر مظہری

ملک میں فساد پھیلاتے مت پھرو (القرآن)

آنکھ جو سوچتی ہے

(ناول)

آنکھ جو سوچتی ہے

(ناول)

کوثر مظہری

ناشر

علی سنز پبلی کیشن دھلی -۲۵

نام کتاب : آنکھ جو سوچتی ہے (ناول)

مصنف : کوثر مظہری

اشاعت : ۲۰۰۰ء

قیمت : ۱۵۰/روپے، ۲۰ ریال، دس امریکی ڈالر (بیرون ملک)

مطبع : عفیف پرنٹرس، لال کنواں، دہلی ۶

کمپوزنگ : ذہین کمپیوٹر، ابوالفضل انکلیو، دہلی (Ph 6317124)

سرورق : شعیب رضا

تعداد : چار سو

تقسیم کار : مکتبہ جامعہ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں دہلی ۶

: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس گولا مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۲

: بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴

: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

: عثمانیہ بک ڈپو، لور چیت پور روڈ، کلکتہ

Published by ALLY SONS PUBLICATION 838/23 Ist Floor New Market Chitla Gate Chawri Bazar Delhi-6 Ph: 3256711	AANKH JO SOCHTI HAI (NOVEL) By KAUSAR MAZHARI Rs- 150/-

نوٹ: اس ناول کے کرداروں اور مقامات سے کسی طرح کی مماثلت محض اتفاقیہ ہوگی۔ کسی طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف دہلی کی عدالت میں ہو سکتی ہے۔

انتساب

کفن
میلا آنچل
خدا کی بستی
گریز
آنگن
کھول دو
بازار میں نیند
الاؤ
نادید
فائر ایریا

موازنۂ انیس و دبیر
ادب اور زندگی
اردو تنقید پر ایک نظر
آدمی اور انسان
ادب و نظریہ
اردو شاعری کا مزاج
شعر، غیر شعر اور نثر
ادبی تنقید اور اسلوبیات
منٹو ایک مطالعہ
بیدی نامہ

ناول سے پہلے

اس ناول کا خاکہ ۶؍ دسمبر ۹۲ء کے بعد بننا شروع ہوا اور کچھ چیزیں اسی وقت ضبط تحریر میں آگئیں۔ میں نے سیتا مڑھی کے دو تین گاؤں کا دورہ بھی کیا۔ کچھ حقائق جمع کیے۔ جنوری ۱۹۹۳ء تک اس کے پچاس صفحات لکھ لیے گئے۔ اس کے بعد نامساعد حالات نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچنے نہیں دیا۔ مگر اس کا پلاٹ، اس کے کردار اور واقعات مستقل سات برسوں تک میرے دل و دماغ پر چھائے رہے۔ جب ذہن کو فراغت نصیب ہوئی تو پرانے پولی بیگ میں سینت کر رکھے ہوئے کاغذات کو باہر نکالا اور جھاڑ پونچھ کر صاف کیا۔ مسودے کو پڑھا، سمجھا اور پھر سوچا۔ اس طرح پڑھ کر سمجھنے اور سمجھ کر پڑھنے کے بعد سوچ کو ایک سمت ملی۔ اب تمام واقعات، کردار اور تلازمات کو ذہن میں حاضر کرنے کی کوشش کی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اب قلم اٹھایا جاسکتا ہے تو لکھنا شروع کیا۔ جس طرح زندگی اچانک ختم ہوجاتی ہے اسی طرح ناول بھی ختم ہو سکتا ہے کہ یہ بھی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ بلکہ زندگی ہوتا ہے۔

کچھ دوستوں نے میرے اس میلانِ طبع پر نکتہ چینی کی کہ آپ کا میدان شاعری اور تنقید ہے، اِدھر کہاں؟ میں نے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ

میں نے کوئی زبردستی والی تحریر پیش نہیں کی ہے۔ میں نے اپنی تحریر کو آنکنے کے لیے ایک غیر رسمی ریڈنگ سیشن رکھا۔ دوستوں کا تاثر حوصلہ افزا رہا۔

میں بے حد شکر گزار ہوں جوگندر پال صاحب کا کہ انہوں نے پورا مسودہ پڑھ کر قیمتی مشورے دیے، ساتھ ہی میں ممنون ہوں اپنے استاد محترم پروفیسر شمیم حنفی کا جنہوں نے اس ناول کی زبان کے تعلق سے اہم مشورے دیے جن کی روشنی میں کئی مقامات پر تبدیلیاں کی گئیں۔ جن دوستوں نے میری ہمت افزائی کی ان میں کچھ اہم نام اس طرح ہیں: شہپر رسول، محمد علیم، مولا بخش، اسلم جمشید پوری، راشد انور راشد، شعیب رضا، احمد صغیر، ابوالکلام، شاہ عالم، عرفان احمد، عادل حیات، صفدر علی ندوی وغیرہ۔ میں شہاب الدین پھنہروی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ایک ایک لفظ سن کر پورے ناول پر بھرپور تجزیاتی بحث کی۔ رضوان کے کردار کو مستحکم کرنے اور اس میں شدت پیدا کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

اب اس ناول کا موضوع، اس کی کردار نگاری، منظر کشی، مکالمہ نگاری اور اسلوب جو کچھ بھی ہے اور جیسا بھی ہے آپ کے سامنے ہے۔ زبان کا کچا پن میری ناتجربہ کاری کا شعوری اور غیر شعوری شناخت نامہ ہے۔ دراصل دیکھنا یہ ہے کہ اس ناول کا مرکزی کردار رضوان اپنے ماضی، حال اور مستقبل کا نقطۂ اتصال بن کر زندہ ہے یا اس کی ناگہاں جسمانی موت اس کی متحرک سوچ کے راستے میں حائل ہو گئی ہے۔

کوثر مظہری

۱۹ر مئی ۲۰۰۰ء

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

۱

رخ کائنات پر سیاہ چادر سی تن گئی۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں میں لوٹ آئے۔ شیر خوار بچے رات ہوتے ہی اپنی ماؤں کی گود میں دبک کر سوگئے۔ جاڑے کی رات ایسے بھی پہلے آتی ہے اور دیر سے جاتی ہے یا یوں کہیے کہ سرد راتوں میں مسافت شب طے کرنا بڑا ہی صبر آزما ہوتا ہے۔ ایک عاشق مہجور کے لیے اور بھی قیامت کی گھڑی ہوتی ہے۔ البتہ چوروں، اچکوں سفاکوں، فسادیوں، سفید پوشوں دلاّ لی کرنے والے پولس افسروں اور سازش کرنے والوں کے لیے جاڑے کی رات بڑی ہی دل فریب، سود مند اور حسب حال ہوتی ہے۔

ان لوگوں سے الگ بھی ایک جماعت ہوتی ہے جس کے لیے یہ طویل رات نہ خوش کن ہوتی ہے اور نہ اذیت ناک۔ اس جماعت والے کبھی یوں خواب خرگوش میں ہوتے ہیں کہ صبح کا ناشتہ بے معنی ہوجاتا ہے، اور کبھی رات بھر آسمان کے چھٹکے ہوئے تاروں کو گن گن کر سحر کی آمد کا شدت سے انتظار کرتے ہیں جیسے صبح نو کی کرنیں ان کی تمام اضطراری کیفیتوں کو دور کرکے دماغ کو روشن کردیں گی۔ رضوان بھی اسی قبیل کا انسان تھا۔ آج اس کے دل و دماغ پر سوچ کا عفریت غالب تھا۔

رضوان اپنے بستر پر دراز کسی گہری سوچ میں تھا۔ جب بھی وہ اطمینان سے کسی مسئلے پر غور کرتا تو اپنا سر تکیے سے نیچے رکھ لیتا۔ شاید اسی طرح اسے سکون ملتا ہوگا۔

نہ معلوم آج اسے دو روز پہلے جمعہ کا خطبہ کیوں یاد آرہا تھا۔ امام صاحب نے بڑی جوشیلی اور جذباتی تقریر کی تھی۔ رضوان کے ذہن پر تقریر کا یہ حصہ بالکل جیسے نقش ہو گیا تھا............

''مذہب اور کلچر میں خواہ جس قدر بھی فرق ہو، اپنے اپنے روایتی ورثے اور تہذیبی سرمائے پر وہ جس درجہ بھی چاہیں فخر کریں، مگر وطن کی پاسبانی کے لیے ہر ایک فرقے کو مل کر شانہ بہ شانہ چلنے کی ضرورت ہے...... مولانا آزاد نے متحدہ قومیت کا کتنا خوبصورت نقشہ پیش کیا ہے کہ ہمارے پاس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جاسکتے۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علاحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا......''

رضوان نے اپنے دوست پرویز سے جب تقریر کے اس حصے کا ذکر کیا تھا تو اس نے کتنی لاپروائی سے کہا تھا............

''چھوڑو یار! تم تو خواہ مخواہ اس طرح کے معمولی اور گھسے پٹے پہلو پر سوچ سوچ کر اپنا دماغ خراب کرتے رہتے ہو، چائے پیو اور چلو......''

رضوان کو پرویز کے اس ردعمل سے بہت دکھ ہوا تھا اور اس نے

کہاتھا...... ”پرویز! تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں ان دنوں کن حالات سے گزررہا ہوں۔ چائے پی کر چلے جانے سے میں ان تفکرات سے آزاد نہیں ہوجاؤں گا۔“

دونوں میں بہت دیر تک مباحثہ اور مکالمہ ہوتا رہا تھا۔

اس نے رضوان سے یہ بھی کہا تھا کہ آخر دنیا میں اتنے لوگ ہیں کسی کو فکر کیوں نہیں ہوتی۔ میں تو کہتا ہوں کہ دنیا کے جھمیلے میں مت پھنسو اور مذہبی نکات میں بھی مت الجھو۔ اس دور میں اگر صوم وصلوٰۃ کا فریضہ ادا کرلو، یہی بہت ہے۔ تم کس کس کو سدھارتے رہوگے۔ رضوان بڑا پریشان رہاتھا۔ آج پرویز کی باتیں یاد آکر اسے اور پریشان کررہی تھیں۔ البتہ خالدامام سے جو باتیں ہوئی تھیں اس سے رضوان کو کچھ تقویت ملی تھی۔ رضوان نے خالد امام سے جب خدا بخش لائبریری سے آتے ہوئے اپنے ردعمل کا اظہار کیا تھا کہ دیش میں آج ان پڑھ اور پڑھے لکھے سب ایک سے کیوں ہوتے جارہے ہیں، آج یہاں جان کی کوئی قیمت ہی نہیں رہ گئی ہے، فرقہ پرستی کا بول بالا ہے تو خالد امام نے رضوان کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہاں فرقہ پرست جماعتوں پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ساتھ ہی اشتعال انگیزی بڑھتی جارہی ہے۔ نئے ذہنوں کو خراب کیا جارہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ سالا اس دیش کا کوئی مائی باپ ہے ہی نہیں۔ رضوان کو خالد امام کی یہ بات مناسب معلوم ہوئی تھی اور پھر اس نے اپنے احساس کا اظہار بھی کردیا تھا کہ مجھے تو غصہ آرہا ہے مولانا آزاد پر کہ انھوں نے دوقومی نظریے کو موت کے مشابہ کیوں قرار دیا تھا۔ ہم سب اگر پاکستان میں ہوتے تو کم سے کم یہاں کے کٹر پنتھیوں اور فرقہ پرست جماعتوں کے طعنے تو سننے نہیں پڑتے۔ ہم وہیں دکھ سکھ سہتے اور اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتے۔ ہمارے آباواجداد نے بھی تو مشعل

آزادی کی لو بڑھانے میں اپنا لہو جلایا ہے۔ پھر آج صبح آزادی کی کرنوں پر کیوں ہمارا حق نہیں ہے ...... آج بھی ہم اجنبیت کے سائے میں کیوں جی رہے ہیں۔

رضوان کو نیند آسانی سے نہیں آتی تھی۔ اس طرح آج بھی اسے پرویز اور خالد امام سے ہوئی گفتگو یاد آرہی تھی۔ خالد امام کے ساتھ دیش کی گھٹیا سیاست اور فرقہ پرستی پر رضوان کی گفتگو ہوئی تھی، اس کے بعد ذاتی زندگی اور مصروفیت کا ذکر چھڑ گیا تھا۔ رضوان نے جب چائے پیتے پیتے خالد امام سے پوچھا تھا کہ تمہارا سلکشن بی پی ایس سی میں ہوا کہ نہیں تو خالد امام نے کس بے چارگی سے جواب دیا تھا...... "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں، اب تو ہمت جواب دے چکی ہے، گارجین بھی میری کارکردگی سے خوش نہیں ہیں۔" خالد امام کا چہرہ اس وقت کیسا بجھا بجھا سا لگ رہا تھا۔ رضوان یہ سوال کر کے خود کو قصوروار تصور کر رہا تھا کہ بیکار ہی اس نے خالد کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر اس نے کس طرح خالد امام کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا...... ہمت مت ہارو بلکہ لگے رہو۔ Optimist بننے کی کوشش کرو۔ انشاء اللہ کامیاب ضرور ہو جاؤ گے ...... رضوان نے بڑی محبت سے خالد امام کو تسلی دی تھی۔ حالاں کہ وہ خود بھی دو چند سال تک اسی راہ پر گامزن رہا تھا۔ اب اس نے اپنے آپ کو ان سب سے الگ کر لیا تھا۔ کچھ تو حالات کا عمل دخل تھا اور کچھ اس کی افتاد طبع کا بھی ہاتھ تھا۔ اب رسالوں میں اس کے مضامین بھی شائع ہونے لگے تھے اور کبھی کبھی ریڈیو سے پروگرام بھی نشر ہوتا۔ اس طرح جو رقم مل جاتی اسی پر رضوان اکتفا کر لیتا۔ زیادہ تر وقت مذہب اور فلسفے کی کتابوں کے مطالعے میں صرف ہوتا۔ قرآن کے مفاہیم و مطالب پر بھی خوب محنت کرتا۔

ہمیشہ وہ کسی مسئلے سے الجھا رہتا۔ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا جیسے وہ کسی الجھن سے دوچار ہو۔ بے روزگاری نے اسے کچھ دنوں پریشان رکھا مگر جیسے جیسے مطالعے میں اس کا انہماک بڑھتا گیا، فکر معاش کم ہوتی گئی۔ بے روزگاری سے تنگ آکر بہت سے نوجوان خودکشی کر لیتے ہیں۔ رضوان کی نظر میں یہ بزدلی اور کم ہمتی والی بات تھی۔

خالد امام نے آج اس کے سامنے اپنی مالکہ کا ذکر چھیڑ کر اس کی جمالیاتی حس کو بیدار کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ایک ہم جماعت کی تصویر پھر گئی۔ اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ شاید اسے کوئی یادگار لمحہ یاد آگیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ ایک مرتبہ جب وہ ایم۔ اے کی کلاس کر رہا تھا تو شبنم ٹھیک اس کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ کسی بات پر شبنم نے بڑی شوخی سے اس کی پیٹھ پر چٹکی لے لی تھی۔ اچانک جب اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو شبنم کی برق بار مسکراہٹ سے وہ لاجواب ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ استاد محترم جب کلاس سے چلے جائیں گے تو وہ شبنم کی خوب گوشمالی کرے گا۔ مگر ایسا کچھ نہ ہو سکا۔ اس کی خموش طبعیت اور کم آمیزی نے اسے کسی بھی اقدام سے باز رکھا۔ شبنم کی بے تکلفی کلاس میں مشہور تھی۔ ابوبکر رضوی، معراج، امتیاز، عاکف، عابد وغیرہ کو اکثر وہ پریشان کیا کرتی تھی۔ یہ سب سوچتے سوچتے اسے کب نیند آگئی پتہ بھی نہیں چلا۔
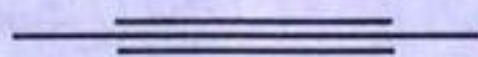
آج اس کی آنکھ تڑکے کھل گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا۔ اس کے بعد ساڑھے آٹھ بجے کی علاقائی خبریں سننے لگا:

”ابھی ابھی سماچار پراپت ہوا ہے کہ سیتا مڑھی میں درگا پوجا کے اَوسَر پر مورتی لے جاتے ہوئے دو گٹوں میں جھڑپ ہو جانے سے تناؤ پیدا ہو گیا ہے۔ استھتی عینترن میں بتائی جاتی ہے“

رضوان کو لگا جیسے اس کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔

”پھر ہو گیا.......... دیکھیے آخر ہو ہی گیا۔ سالے ان فرقہ پرستوں کا کوئی علاج ہی نہیں ہے......“

اچانک اس کے چہرے کا رنگ فق پڑ گیا۔ آخر یہ کیسا احساس تھا۔ اس زمین پر دوسرے لوگ بھی تو رہتے ہیں۔ اس طرح کے اور بھی نہ جانے کتنے خون چکاں واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ مگر بہتوں پر تو ان کا کچھ اثر تک نہیں ہوتا، کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی.......... رضوان تیز تیز قدموں سے کمرے میں چلنے لگا۔ کبھی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھتا، کبھی اپنی ایک بوسیدہ کرسی پر آ کر بیٹھ رہتا۔ دراز سے اس نے ایک سگرٹ نکال

کر سلگائی اور دھواں کے مرغولے فضاؤں میں بنانے لگا۔ کبھی کبھی بے خیالی
میں وہ بڑبڑانے لگتا اور اپنا سر جھٹک دیتا۔ کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا وہ سوچ
میں یوں ڈوبا کہ بت بن گیا اور اس وقت چونکا جب سگرٹ اس کی انگلیوں
کو جلانے لگی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی
ہے۔اسے حیرت بھی ہوئی اور وہ خود سے سمجھوتہ کرلینے کی ناکام سی کوشش
کرنے لگا۔ وہ تازہ اخبار اٹھا کر سرخیاں دیکھنے لگا۔ اس نے سوچا کہ یہ کون
سی نئی بات ہے کہ وہ خواہ مخواہ اس درجہ متفکر ہو گیا۔ اس میں بے چینی اور
پریشانی کی کون سی بات ہے۔ ایسی خبریں تو ہمیشہ ہی اخباروں میں آتی رہتی
ہیں۔ مراد آباد، میرٹھ، ملیانہ، بھیونڈی، بھاگل پور...... یہ سب تو فسادات
کی زندہ مثالیں ہیں۔ آج اگر سیتا مڑھی میں ہو گیا تو اس میں بھونچکا ہو کر
اپنا سر پھوڑنے کی کون سی بات ہے؟ اگر فسادات نہیں ہوں گے تو دیش
کے سیاسی رہنماؤں کی دکانیں کیسے چلیں گی؟ پھر یہ جو اخبارات ہیں ان کا کیا
ہوگا اور بالخصوص اردو اخبارات تو مرچ مسالے میں ڈوبی ہوئی خبروں سے
ہی چلتے ہیں۔ عوام الناس کی نفسیات کو شاید سب سے زیادہ اردو اخبار والے
ہی سمجھتے ہیں.......... محض ایک لمحے میں اس نے سب کچھ سوچ لیا اور پھر
اخبار کے صفحات الٹ پلٹ کرنے لگا۔ اس وقت اس کی نظر میز پر پڑے
وزیٹنگ کارڈ پر پڑی۔ اچانک خیال آیا کہ اسے آج خالد امام سے ملنے ماڈرن
گارمنٹس فیکٹری جانا ہے۔ گیارہ بجنے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ اس وقت کا
استعمال اس نے کچھ رسمی اور غیر رسمی خطوط لکھنے میں کیا۔ ساڑھے دس بجے
وہ تیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر آیا۔ آٹو کے لیے دس منٹ انتظار کرنا پڑا۔
ایک آٹو میں پیچھے جگہ ملی۔ پٹنہ میں یہی وقت ہے سڑکوں پر ہجوم کا۔ کبھی
کبھی سڑک اس طرح جام ہو جاتی ہے کہ اہم سے اہم کام التوا میں جا پڑتا

ہے۔ سائیکل والے، ٹھیلہ والے، آٹو والے، جیپ اور نجی کار والے اور پیدل چلنے والے سب کے سب آپ میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی اس دھکم پیل میں پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون کس طرف جارہا ہے۔ اگر آپ سائیکل پر سوار ہیں اور غلطی سے کسی کار کو آپ کی سائیکل چھو گئی، پھر دیکھئے کیسے شیشہ اٹھتا ہے اورپان کی پیک پھینکتے ہوئے کوئی غنڈہ نمانیتا یا نیتا نماغنڈہ آپ کو گھورتے ہوئے کہتا ہے ...... ''اندھے ہو کا''؟ یہاں ٹریفک رول' نام کی کوئی چیڑیا نہیں ہوتی ۔ ہو گی کسی زمانے میں ۔ مگر جس زمانے میں رضوان جیتا تھا اس کا تو یہی حال تھا اور اب تک ایسا ہی ہے۔ جب بھیڑ بہت بڑھ جاتی ہے اور کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا ہے تو ٹریفک پولس وِسل بجاتے بجاتے کسی گلی میں گھس جاتی ہے یا ایک طرف ہو کر کھینی کھانے لگتی ہے۔ رضوان کا آٹو بھی بھیڑ میں پھنس گیا۔ اسے خالد کے آفس پہنچنے میں تاخیر ہو گئی۔ بھیڑ میں پھنسا ہوا وہ سوچ رہا تھا کہ ایک بار پٹنہ کالج کے سامنے محلے والوں نے بجلی بحران کے خلاف سڑک جام کیا تھا۔ لوگ اتنے مشتعل تھے کہ انھوں نے تمام گاڑیوں کو روک رکھا تھا۔ سڑک کو رکشا، ٹھیلہ، چوکی وغیرہ رکھ کے جام کردیا گیا تھا۔ سائیکل سوار کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ایک سیریس مریض آٹو میں لایا گیا جسے ہسپتال جانا تھا مگر اسے بھی وہاں سے گزرنے نہیں دیا گیا یہاں تک کہ وہ مریض اس دنیا سے ہی گزر گیا۔ اس وقت رضوان کی جو حالت ہوئی تھی اس کا بیان شاید ممکن نہیں۔ وہاں سڑک روکے لوگوں میں سے کچھ غیرت مندوں کو شرم بھی آئی تھی کہ ان کی ہٹ دھرمی سے ایک شخص کی جان چلی گئی۔ وہاں کھڑی پولس لا اینڈ آرڈر برقرار رکھنے میں مصروف تھی۔

آٹو ''سپنا اپارٹمنٹ'' کے قریب آگیا۔ رضوان آٹو سے اتر کر

سیدھا سکنڈ فلور پر پہنچا۔ گارمنٹس فیکٹری کا ویل فرنشڈ چیمبر سامنے نظر آیا۔ رضوان چیمبر کے پاس گیا۔ اندر جانا چاہا تو وہاں بیٹھے ایک نیپالی دربان نے مزاحمت کی۔ اس نے وزیٹنگ کارڈ دکھایا اور خالد امام کا نام بتایا۔ رضوان کو باہر رکنے کے لیے کہتا ہوا دربان اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ باہر آگیا۔

"جی آپ اندر جاسکتا ہے۔"

"تھینک یو"

رضوان اندر داخل ہوا تو سامنے ایک لیڈی بیٹھی تھی۔ عمر پچیس چھبیس رہی ہوگی۔ وہ فائل پر نظریں گاڑے ہوئی تھی۔ رضوان نے مسرت اور جھجک کے ملے جلے انداز میں کہا۔

"گڈمارننگ میڈم"

"گڈمارننگ ...... پلیز ہیویور سیٹ"

اس کی نظریں اب بھی فائل میں کھوئی ہوئی تھیں۔ چند لمحوں بعد اس کی شوخ نظریں اوپر اٹھیں ۔ رضوان اپنی جگہ پر تلملا کر رہ گیا۔ شاید اس طرح اچانک کسی پیکر حسن سے سامنا کے لیے وہ کسی طرح تیار نہ تھا۔ اس لیڈی کے چہرے پر ایک عجیب سی سحر انگیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"جی کہیے، کیسے آنا ہوا ؟......"

"دراصل، وہ کیا ہے کہ ...... دراصل میں، جی وہ کیا کہتے ہیں کہ میرا نام رضوان ہے اور آج خالد امام نے مجھے یہاں بلایا تھا"

رضوان نے گھبراہٹ میں ایک لمبا جملہ ادا کردیا۔

"اوہ!............ آئی سی"

”یو مسٹ سی“

”کیا مطلب......؟“

”میرا مطلب ہے کہ خالد امام آج آیا ہے کہ نہیں؟“

"Of course he has come"

اس لیڈی نے گھنٹی بجائی اور چپراسی حاضر ہو گیا۔

”جی میم صاب!“

”اکاؤنٹ آفس سے ذرا خالد کو بلا کر لاؤ اور ہاں آتے ہوئے کینٹین سے تین پیالی کافی لیتے آنا......Okay"

”جی میم صاب“ چپراسی چلا گیا۔

لیڈی پھر مخاطب ہوئی۔

”میرا نام......“

”زیبا کلیم......“ رضوان نے جیسے لقمہ دیا۔

”مگر آپ کو کیسے معلوم......“

”کل خالد امام نے دوران گفتگو آپ کا نام بتایا تھا۔

”وہ بھی عجیب آدمی ہے۔ مجھے تو آپ کے بارے میں اس نے کچھ نہیں بتایا۔“

”مجھے رضوان کہتے ہیں۔ میں نے یہیں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا ہے۔“

رضوان نے اپنا مختصر تعارف پیش کیا اور دیواروں پر لگی پینٹنگز دیکھنے لگا۔

”میں نے ہی یہ پینٹنگز بنائی ہیں۔ میں نے بھی یہیں پٹنہ یونیورسٹی سے فائن آرٹس میں گریجویشن کیا ہے۔

میرے پاپا کا اپنا کاروبار پھیلا ہوا تھا اور دوسرا کوئی وارث نہیں تھا، پھر یہ کہ وہ سارا کاروبار سنبھال نہیں پاتے ہیں۔ "So, I had to discontinue my study "

زیبا کے چہرے پر کیف آور لکیریں پھیل گئیں۔

"ہاں ہاں یہ تو آپ کا فرض بھی بنتا ہے کہ اپنے والد کا خیال رکھیے"

خالد اسی لمحے زیبا کے چیمبر میں داخل ہوا۔

"آؤ خالد تمہارے دوست تم سے ملنے آئے ہیں" زیبا نے اپنے بالوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے کہا۔

"کب آئے تم ؟" خالد امام نے مصافحہ کرتے ہوئے رضوان سے پوچھا۔

"بس ابھی ابھی، پانچ سات منٹ پہلے، چوں کہ کل تم سے میں نے وعدہ کرلیا تھا اس لیے اس کا پورا کرنا بھی ضروری تھا۔"

رضوان نے جواب دیا۔

"یہ بھی خوب رہی، آج کل تو وعدہ اور پرومس بس ایک فیشن ہے۔ کیا ضروری ہے کہ اسے پورا بھی کیا جائے، کیوں رضوان صاحب؟"

زیبا کی گفتگو کا انداز کچھ ایسا تھا کہ بیچارہ رضوان مارے شرم کے مختصر سی فرمائشی ہنسی پر موقوف رہا۔ اس نے برجستہ اس کی وضاحت کردی۔

"چوں کہ میں خالد امام کا دوست ہوں اس لیے آپ مجھے صرف رضوان سے بلا سکتی ہیں۔
"پھر کیوں نہ آپ بھی مجھے صرف زیبا سے پکاریئے" "ہم سب یہاں بے تکلف دوست کی طرح رہتے ہیں"
اسی درمیان اس کی نظر انگریزی روز نامہ " دی ٹائمز آف انڈیا" کی اس سرخی پر پڑی ہ :

"Communal clash in sitamarhi, six died,

twenty injured."

رضوان کی ہیجانی کیفیت بڑھ گئی ۔ جہاں اس کا دل زیبا کے سامنے حافظ شیرازی کا یہ مصرعہ گنگنارہا تھا ۔
"دل می روم زدستم صاحب دلاں خدارا"
وہیں دل کے کسی گوشے سے خواجہ میر درد کا یہ مصرعہ ابھرا
"زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے"
زیبا اور خالد امام نے رضوان کے متغیر چہرے کو بھانپ لیا۔
کیوں کیا ہوا...... ؟ زیبا نے رضوان سے پوچھا۔
"یہ .... یہ دیکھ رہی ہو تم ؟ یہ نیوز پڑھی تم نے ؟"
"ہاں ہاں پڑھی تو ہے۔ مگر اتنے پریشان کیوں ہو؟"
زیبا نے اپنا طرز تخاطب بدلتے ہوئے کہا۔
"فساد ہو گیا، لوگ مر رہے ہیں...... اور ......اور تم اتنی سرد مہری سے کہہ رہی ہو کہ ہاں پڑھی تو ہے"
رضوان پیچ وتاب کھارہا تھا۔
"ری لیکس مسٹر رضوان، ری لیکس، یہ کون سی نئی نیوز

ہے۔ لوگ تو دنیا میں مرتے ہی رہتے ہیں اور یہ
Communal Riots کا ہونا تو اس دیش میں عام
سی بات ہے۔ گویا روز مرہ میں شامل ہے۔ اور جیسا کہ
آپ کو معلوم ہے کہ روز مرہ کے واقعات نیوز نہیں
کہلاتے"۔
زیبا نے کچھ اس طرح تبصرہ کیا کہ رضوان حیرت زدہ رہ گیا۔
"آئی نو مس زیبا، آئی نو اِٹ، لیکن کیا ہم اتنے بے حس
ہوگئے ہیں کہ فسادت اور ان کے اسباب پر گفتگو بھی
نہیں کرسکتے؟"
چپراسی کافی لے کر حاضر ہوا اور ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔
"Have your coffee"
زیبا نے اپنی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔ خالد امام نے اپنی پیالی
اٹھالی......
"No, thank you میں چلتا ہوں"۔
یہ کہتا ہوا رضوان اٹھ کر چلنے لگا۔
خالد امام نے رضوان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا......
"بیٹھو تو سہی۔ یہ کافی تو پی لو"
"نہیں ...... مجھے جانے دو، پھر کبھی!"
زیبا نے ایک بار پھر کہا...... "پلیز میری خاطر"...... رضوان نے
اس بار کچھ کہے بغیر پیالی اٹھائی اور بہ سرعت تمام کافی حلق میں انڈیل
لی۔ وہاں سے سلام کرتا ہوا نکل پڑا۔ زیبا اسی طرح At ease ہو کر
انگلیوں میں قلم پھنسائے شکر ریزی کرتی رہی۔ رضوان سڑک پر اس تیزی

سے چل رہا تھا جیسے موسم گرما میں کسی نے اس کی کھوپڑی میں آگ کا لاوا بھر دیا ہو۔ وہ بڑبڑاتا بھی جا رہا تھا:

"یہ سب ہندوؤں کی چال ہے۔ اور ایک طرح سے یہ سالے مسلمان بھی کم پاگل نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ہندو مسجد کے پاس سے مورتی اور جلوس لے جاتے ہیں تو اس سے ہوتا کیا ہے۔ دونوں فرقوں میں چند غیر سماجی عناصر ہیں جو اشتعال کی صورت پیدا کرتے ہیں۔ ان کو نہ گنگا جمنی تہذیب سے کوئی سروکار ہے اور نہ قومی ایکتا سے کوئی مطلب، تو پھر حکومت چپ تماشا کیوں دیکھتی ہے۔ ختم کر دے ان کمینوں کو جو فساد کی جڑ ہیں، ہندو ہوں کہ مسلم۔ جو پر امن ماحول کے دشمن ہیں انھیں اس سرزمین پر رہنے کا کیا حق ہے .... میں کہاں جاؤں۔ کمرے پر یا پروفیسر صابر علی سے چل کر کچھ باتیں کروں؟...... مگر ابھی تو شاید وہ اپنے گھر پر موجود نہیں ہوں گے۔ پرویز نے کل بتایا تھا کہ آج انھیں قومی ایکتا کی کسی میٹنگ میں جانا تھا.......... ایسا کرتا ہوں کہ عظیم کے کمپیوٹر کوچنگ چلتا ہوں۔ وہاں شاید نسیم اور ثاقب بھی مل جائیں گے ......"

یہ سارے خیالات رضوان کے پردہ ذہن پر خود کلامی کی شکل میں ابھرتے چلے گئے۔ راستے میں وہ کمپیوٹر کوچنگ کے نزدیک پہنچ کر کچھ دیر سوچتا رہا، پھر دروازے پر دستک دی۔ عظیم نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا......

"اخاہ! How are you ?

" Where are you from ?

"میں خالد سے ملنے گیا تھا، وہیں سے آرہا ہوں۔ آج سیتا مڑھی کے بارے میں کوئی نیوز پڑھی تم نے ؟"

"ہاں پڑھی ہے...... مگر کیوں، خیریت تو؟؟"

"ارے وہاں فساد ہو گیا...... اور تم پوچھتے ہو...... کیوں ؟"

"ایسا تو لائف میں ہوتا ہی رہتا ہے، ان باتوں میں اپنا وقت ضائع کیوں کرتے ہیں؟ میں تو کہتا ہوں کہ آپ بھی کمپیوٹر سیکھ لیجیے، پھر دیکھیے کہ لائف کتنی Busy ہو جاتی ہے۔"

عظیم کے اس رویّے پر رضوان کا تاثر کچھ ایسا رہا:

"Thanks for your kind suggestion. But I don't like such an isolated life as you do."

عظیم بھی اپنے موقف پر قائم رہا اور اس نے جواباً عرض کیا۔

Rizwan Bhai, without computer, you can't imagine your life in 21st century.

رضوان نے چلتے چلتے اپنا آخری تاثر دیا......

"مبارک ہو تمھیں تمھاری کمپیوٹر لائف، اچھا یہ بتاؤ کہ آج ثاقب اور نسیم آئے ہیں کہ نہیں"۔

"نہیں آج دونوں میں سے کوئی نہیں آیا ہے۔ مگر پلیز آپ ٹھہریے تو سہی"

عظیم نے رکنے کی درخواست کی، مگر رضوان پر تو ایک طرح کی بے چینی سوار تھی، اس نے طنزیہ عرض کیا......

"ایسے بھی کمپیوٹر لائف تو بہت Busy ہوتی ہے۔ تم اپنا وقت کیوں خراب کرنا چاہتے ہو............ خدا حافظ!"

رضوان وہاں سے سیدھا اپنے کمرے پر آگیا۔ وہ بستر پر سونے کی کوشش کررہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ ایم ایس کالج موتیہاری (مشرقی چمپارن) میں بی ایس سی کا طالب علم تھا تو اس کا ایک دوست راجیش تھا۔ آٹھ سال گزر جانے کے بعد بھی اس سے خط وکتابت جاری تھی۔ جب دونوں ساتھ ساتھ سیر وتفریح کو نکلتے اور اگر نماز کا وقت ہوجاتا یا اذان کی آواز سنائی دیتی تو راجیش کہتا...... "رجوان جی نماج پڑھ لیجیے"۔ رضوان مسجد میں داخل ہوکر نماز ادا کرتا اور راجیش باہر کھڑا اس کا انتظار کرتا رہتا۔ کتنی اچھی ذہنی ہم آہنگی تھی ۔ کاش اس ملک کے ہر شہری کو راجیش کی فکر کا عشر عشیر بھی مل جاتا، پھر تو یہ انتشار ہی ختم ہوجاتا۔ مگر شاید یہ ممکن نہیں کہ یہاں کی کچھ فرقہ پرست تنظیمیں نئی نسل کے ذہن میں زہر گھول رہی ہیں۔ فساد خود بخود نہیں ہوجاتا۔ بلکہ اس کے پیچھے ان تنظیموں میں سے کسی کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ ان تنظیموں کے منشور بظاہر تو کچھ ہوتے ہیں مگر پس پردہ دوسرے منشور پر عمل کیا جاتا ہے۔ ان تنظیموں سے جڑے ہوئے لوگ قانون اور ضابطے سے بالاتر ہوتے ہیں۔ رضوان سوچ رہا تھا کہ جب تک اس ملک میں سید سلام الدین، پی ایل مٹکانی، گھوش منگل، پریما بھارتی ، سیف اللہ اعظمی، امام سعد اللہ ہزاری جیسے لوگ رہیں گے، ہمیشہ یہاں اتھل پتھل ہوتی رہے گی۔ حالاں کہ یہ سب کے سب مذہب کی آڑ میں سیاسی سطح پر کرسیاں ہتھیانے کی دھن میں رہتے ہیں۔

مذہب اسلام یا ہندو مذہب سے انھیں دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ ایسے ہی لوگوں کو گندم نما جو فروش کہتے ہیں یا پھر شیر کی کھال میں بھیڑیا......

سوچتے سوچتے رضوان بے سدھ ہو رہا تھا۔ اس نے ادبی رسالہ ''شاعر'' کا تازہ شمارہ اٹھالیا۔

فکر امروز...... سیماب اکبر آبادی

تسکیں کی طلب ہے تو مناظر کی طرف آ
باطن ترے بس کا نہیں ظاہر کی طرف آ

غزل پر نیا تنقیدی مقالہ، اظہار اثر کا جاسوسی ادب پر تبصرہ، علیم اللہ حالی اور احمد وصی کی نظمیں؛ مخمور سعیدی، محسن زیدی، شہپر رسول کی غزلیں، ساجدہ زیدی کی مٹھی بھر غزلیں، بخط شاعر ادا جعفری کی ایک غزل اور دو نظمیں، سریندر پرکاش کے ناول ''فسان'' کی ۱۳ویں قسط، حجاب امتیاز علی تاج کا ایک عکسی خط بنام مرزا حامد بیگ اور دوسرے بہت سے ابھرتے فنکاروں کی تخلیقات، ایک سرسری جائزہ...... رضوان کی نگاہ پھر پہلے صفحے پر سیماب کے اسی شعر پر آکر رک گئی۔

تسکیں کی طلب ہے تو مناظر کی طرف آ
باطن ترے بس کا نہیں ظاہر کی طرف آ

وہ سوچنے لگا کہ اگر شاعر خود سے مخاطب ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کا مخاطب اگر کوئی دوسرا شخص ہے تو...... تو شاعر کو کیا پتہ کہ کس کے باطن میں کیا ہے اور پھر یہ کہ افکار اندروں اور احساس باطن کسی کے بس کا ہے کہ نہیں، اسے کیا پتہ؟ اسے جگر مراد آبادی کا شعر یاد آیا۔

راز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے

سب سے پہلے دل شاعر پہ عیاں ہوتا ہے

ساتھ ہی ہندی کا یہ مقولہ یاد آیا……

جہاں نہ جائے رَوی وہاں جائے کَوی

آہستہ آہستہ ان تمام خیالات کی کشاکش اور تموج افکار سے وہ قدرے سبک ہوا اور اسے نیند آ گئی۔

۳

ذہن ودماغ پر لاکھ بوجھ ہوں، آپ کے من کے پردے پر طرح طرح کے خوف کے سائے منڈلاتے ہوں، آپ خواہ نہایت ہی پیچیدہ مسئلے کی ادھیڑ بن میں ہوں، اگر نیند کی ملکہ تھوڑی دیر کے لیے آپ کو اپنی آغوش میں لے لے تو یوں سمجھیے کہ تمام کلفتوں اور کشمکشوں سے ذہن سبک ہوگیا، جیسے شیر خوار بچہ ماں کی چھاتی سے لگ کر آسودہ اور مسرور ہو جاتا ہے۔

رضوان جب سو کر اٹھا تو وہ اپنے آپ میں فرحت محسوس کر رہا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر نماز عصر ادا کی۔ اسٹو جلا کر مولانا آزاد والی چائے بنا کر پی لی اور اپنی ایک تازہ نظم "صدائے درد" جیب میں رکھ کر نکل گیا۔ اس کی غزلیں اور نظمیں اردو کے رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ آج اسے اپنی نظم "قومی تنظیم" اخبار کے ادب اڈیشن کے لیے دینی تھی۔ آج اسے پروفیسر صابر علی سے مل کر حالات حاضرہ پر گفتگو بھی کرنی تھی۔ پہلے وہ "بک ورلڈ" پہنچا جہاں پرویز سے ملاقات کرنی تھی۔ اس کے انتظار میں وہاں پہلے ہی سے نسیم بیٹھا تھا۔ وہ پٹنہ کالج میں بی۔ اے کا طالب علم تھا اور رضوان کا رشتہ دار بھی۔ جب وہ اقبال ہاسٹل میں تھا تو جنوری کی سردی

میں بھی رات کے دس بجے کپڑے صاف کرتا اور غسل کرتا تھا، اسے کبھی زکام بھی نہیں ہوا۔ رضوان اسے عزیز رکھتا تھا جب کہ اس کی شوخی اور بدمعاشی سے اس کے گھر والے پریشان رہا کرتے تھے۔ آج نسیم گھر جانا چاہتا تھا۔

"السلام علیکم"......رضوان نے سبھوں کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام"...... کہاں ہیں جناب کل سے نظر نہیں آئے"

پرویز نے جملہ داغا۔

اسی درمیان نسیم ٹپک پڑا...... "میں گھر جانا چاہتا ہوں، جاؤں"؟

"تمہیں روکتا کون ہے؟ روپے تو باپ کے خرچ ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ہر مہینے گھر جانا کیا ضروری ہے"۔

رضوان ایسے بول رہا تھا جیسے اس کی یہ فہمائش نسیم کے لیے بہت اہم ہو۔

"ایں! آپ کو تو خالی یہی رہتا ہے، کہاں ہر مہینے گھر جاتے ہیں؟"

نسیم نے اپنے خاص انداز میں شوخی کی۔

"ہاں بھئی جاؤنا...... مجھ سے پوچھنے کی ضرورت کیا ہے؟"

رضوان نے بیزاری سے کہا۔

"پھر بھی ...... آپ تو میرے گارجین ہیں۔ آپ نے مجھے سدھارنے کا ذمہ لیا ہے"

نسیم کی شوخی بڑھتی جارہی تھی۔ رضوان نے جب نسیم پر طمانچہ اٹھایا تو وہ وہاں سے سلام کرتا ہوا سرک گیا۔

"ہاں پرویز اب تو تمہارے والد صاحب آگئے ہوں گے۔

ان سے ملنا چاہتا ہوں"

رضوان نے پرویز سے سوال کیا۔

"ہاں میٹنگ سے تو آگئے تھے مگر بہتر ہوگا آپ ان سے نماز مغرب کے بعد ملیے۔ یہی وقت ان سے ملاقات کا ہے۔ اس وقت کھل کر تفصیلی باتیں کریں گے"۔

پرویز نے اپنے والد پروفیسر صابر علی سے ملنے کا نسخہ بتایا۔

اس کے بعد ارجن کی چائے منگا کر دونوں دکان ہی پر پینے لگے۔ اس علاقے میں ارجن چائے والا مشہور تھا۔ نماز مغرب وہیں پیر بہور کی مسجد میں ادا کی۔ اس کے بعد پروفیسر صابر علی کے دولت کدے پر حاضر ہوگیا۔ وہاں پہلے ہی سے دو تین بوڑھے آدمی تشریف فرما تھے۔ یہ روز کا معمول تھا کہ مغرب کے بعد شہر کے دوچند چیدہ اور سنجیدہ لوگ وہاں حاضر ہوتے اور سیاسی اور مذہبی مسائل پر تبادلہ خیال کرتے۔ یہاں اکثر کائنات کی دروں بینی اور زندگی کے نشیب و فراز پر مذہب و فلسفے کی روشنی میں گفتگو ہوا کرتی تھی۔ لچھے دار گفتگو کے خواہش مند لوگ اکثر یہاں جمع ہوتے۔ پروفیسر صابر علی کا مطالعہ گہرا تھا۔ انھوں نے عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور ہندی زبانیں پڑھی تھیں، اس لیے وہ ان زبانوں کے ادب اور فلسفے سے بھی باخبر تھے۔ وضع قطع سے بھی وہ بارعب اور تبحر علمی کے حامل نظر آتے تھے۔

رضوان سلام کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ پروفیسر صاحب نے جواب دے کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ رضوان خاموشی سے ایک طرف پڑی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پروفیسر صابر علی کی تقریر جاری تھی:

"آپ غور کریں کہ شہنشاہ اکبر کے اختتام عہد اور عہد جہانگیری کے آغاز میں یہاں علماء اور مشائخ حق کا

فقدان نہیں تھا بلکہ طبقات، روضتہ العلماء اخبار الاخیار،
خزینتہ الاصفیا وغیرہ کے مطالعے سے تو یہی پتہ چلتا ہے
کہ اس وقت ہندوستان میں خانقاہوں اور مدرسوں کی
بہتات تھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ تصوف کے امور
میں جہل وبدعت کی آمیزش بڑھ گئی تھی۔ اللہ نے
حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کو ان مفاسد کی
اصلاح کے لیے منتخب کیا۔ بقیہ حضرات یا تو ضخیم ضخیم
شرحیں لکھتے رہے یا تضلیل وتکفیر کے فتووں پر دستخط
کرتے رہے"۔

اس درمیان ان کا پوتا نشاط میز پر چائے رکھ کر چلا گیا۔ سب
چائے پینے لگے۔ پروفیسر صابر علی نے سلسلہ برقرار رکھا......

"پھر آگے چل کر بارہویں صدی میں حضرت شاہ ولی
اللہ اور حضرت شاہ اسماعیل نے تدوین علوم ومعارف کا
کام کیا۔ اس طرح امت محمدیہ کی مذہبی وتہذیبی روایت
پر پڑی گرد صاف ہوتی رہی .... آج بھی ہماری
مذہبی اور تہذیبی روش بالکل ضلالت اور گمراہی کا شکار
ہو چکی ہے ...... آج بھی کسی مجدد اور مصلح کی سخت
ضرورت ہے ...... مگر .... مگر اصلاح وتجدید کا بیڑہ اٹھانا
لعب صبیان تو ہے نہیں......"

"آپ نے بجا فرمایا...... میں سمجھتا ہوں کے جب تک
مسلمانوں کو راہ راست پر لایا نہیں جاتا اور جب تک
مسلمان فسق وفجور، کذب وافترا اور جھوٹی شان وشوکت

سے ہٹ کر احکام الٰہی اور فرمان رسولؐ کی پیروی میں
لگ نہیں جاتے .... یہ مظالم کے شکار ہی رہیں
گے.........."

مولانا شفیع احمد صاحب امام مسجد نے گویا پروفیسر صابر علی کی اس
علمی تقریر کا حاصل کلام ہی پیش کر دیا۔ چائے نوشی کے بعد دونوں
حضرات رخصت ہوگئے۔ اب پروفیسر صابر علی رضوان سے مخاطب ہوئے......

"کہو بیٹے کیسے آنا ہوا؟ تمہاری پڑھائی لکھائی کیسی چل
رہی ہے؟ اورہاں یہ معلوم ہوا کہ تم نے پبلک سروس
کمیشن دینے کا ارادہ ترک کر دیا ہے؟"

"جی وہ کیا ہے کہ ...... حالات کچھ اتنے پیچیدہ ہوتے
جارہے ہیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسے بھی کمیشن
میں کب کیا ہو، کچھ کہا نہیں جاسکتا، اور پھر یہ کہ آج
کل تو پیروی اور دھاندلی ہر جگہ کھلّم کھلا ہو رہی ہے۔
سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں ......؟"

"بیٹے پھر بھی تمہیں ہارنا نہیں چاہیے تھا۔ دھاندلی اور
پیروی یہ سب کیا ہے؟ تمہیں ان باتوں سے کیا لینا دینا۔
محنت کروگے تو ایسا نہیں ہے کہ تمہارا ہوگا نہیں۔ بغیر
محنت کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ قرآن میں کہا گیا ہے۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی

علامہ اقبال نے اسی مفہوم کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے

"بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا"

"انکل! میں نے یو جی سی کا اکزام دیا تھا اس میں فلیو شپ

کے لیے میرا انتخاب ہو گیا ہے۔ پی ایچ ڈی کے لیے
رجسٹریشن کرانے پر بائیس سو روپے فی ماہ ملیں گے"۔
رضوان نے دور سے آتی ہوئی شعاع امید کو مٹھیوں میں جکڑنے
کی کوشش کی۔
"مبارک ہو...... مگر یہ دائمی حل تو نہیں ہے نا؟ یہ تو بس
"چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے"
"انکل میں اب درس و تدریس کو ہی اپنا کیریئر بنانا چاہتا
ہوں۔ کمیشن کے چکّر میں لڑکوں کا مستقبل خراب بھی
ہوتا ہے۔ دو سال سے تو کمیشن والا اکزام نہیں ہو رہا
ہے۔ آخر کب تک اس کے پیچھے بھاگوں!......"
رضوان نے آج کھل کر اپنا نصب العین پروفیسر صابر علی پر واضح
کر دیا۔
"ہاں بیٹے یہ تو ہے کہ اب کمیشن کا بھی کوئی وقار نہیں
رہ گیا ہے۔ درس و تدریس تو واقعی باوقار سروس ہے بلکہ
خدمت جاریہ ہے۔ خدا کرے تم اپنے مقصد میں کامیاب
ہو جاؤ......!"
یوں لگا جیسے پروفیسر صابر علی رضوان کی سچائی بھری گفتگو کو تسلیم
کر چکے تھے۔ رضوان جس درد اور خلش کو لے کر یہاں آیا تھا اسے ہونٹوں
تک لانے میں پریشانی ہو رہی تھی۔ بار بار رضوان کے ہونٹوں کو جنبش
ہوتی مگر سکوت ہی رہتا۔ آخر کار اس نے اپنی تمام تر توت گویائی سمیٹ کر
کچھ کہنے کی کوشش کی۔
"انکل! سیتا مڑھی میں کل فساد ہو گیا۔ آج تو اخبار میں

نیوز بھی آئی ہے۔ مسلمانوں کے بہت سے گھر جلائے گئے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ ان کا کوئی پرسان حال ہی نہیں ہے ......"

پروفیسر صابر علی کے چہرے پر سنجیدگی اور تجربات کی لکیریں جھریوں کی شکل میں کہیں کہیں نمایاں تھیں۔ انھوں نے بڑی متانت سے رضوان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا......

"بیٹے یہ فساد تو ہندوستان کا مقدر بن گیا ہے۔ انسانوں کا خون دیکھ دیکھ طبیعت اکتا چکی ہے۔میں بھی سوچ رہا ہوں کہ مسلمانوں کے جان و مال کو آج کس درجہ ارزاں کردیا گیا ہے"

رضوان نے سوچا کہ کیوں نہ وہ اپنا تاثر کھل کر بیان کردے۔

"لیکن انکل! کیا اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے ہماری ملت محفوظ رہ سکے گی؟ بابری مسجد کا اتنا ہنگامہ ہوا اور آخر کار مسجد ڈھادی گئی، اب وہاں مندر بنایا جارہا ہے اور ہم خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔ آخر ہمارے جوش اور جذبے کو غیرت کیوں نہیں ہوتی؟"

"ایسا ہے بیٹے! کہ آج کا مسلمان صرف نام کا مسلمان ہے۔ آج کی تباہی کی صرف ایک وجہ سمجھ میں آتی ہے، بقول اقبال ؂

تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر

مسلمانوں کے انحطاط کا جب یہ عالم ہے تو ہمیں اسکا

خمیازہ تو بھگتنا ہی پڑے گا"

صابر علی جانتے تھے کہ رضوان کے دماغ میں بے چین سوچ کا ایک سیلاب اُمڈ رہا ہے جسے کسی طرح نارمل کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے موضوع گفتگو کو بڑی ہوشیاری سے کچھ اس طرح بدلنے کی کوشش کی:

"رضوان! تم جو اپنا مجموعہ کلام "پس بہار" ترتیب دے رہے تھے، اس کا کیا ہوا؟ اسے بہار اردو اکادمی میں مالی تعاون کے لیے جمع کیوں نہیں کر دیتے!"

رضوان اس وقت اس موضوع پر گفتگو کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ اس کے دل میں سوچ کے لامتناہی سلسلے کی ایک لکیر چہرے پر بھی ابھر آئی تھی۔ اس کے اندر ایک طوفان پل رہا تھا۔ اس نے بے دلی سے کہا......

"پس بہار مرتب ہو چکا ہے مگر اسے بہار اردو اکادمی میں جمع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ اکادمی کا تو برا حال ہے...... اس پر بعد میں سوچوں گا کہ کیا کرنا ہے......
آج جو مسئلہ ہمارے سامنے ہے وہ ملی تہذیب کا مسئلہ ہے بلکہ پوری انسانیت غیر محفوظ ہو گئی ہے پھر ہمارا وجود کس کام کا؟"

پروفیسر صابر علی نے سمجھ لیا کہ رضوان اس فساد سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اس وقت اس کے احساسات کو دیکھتے ہوئے اسے تسلی دینا ضروری ہے، ورنہ اس کی فکر کو اور بھی دھچکا لگے گا۔ انھوں نے بڑی سنجیدگی سے رضوان کو سمجھانے کی کوشش کی......

"ہاں بیٹے! اپنے وجود اور ملی اقدار کی بقا کا مسئلہ ابھی

سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہاں ہر لمحہ موت
سر پر ناچ رہی ہے۔ حیوانیت اور درندگی نے انسانیت کو
نگل لیا ہے۔ کچھ تو سوچنا ہوگا کہ آخر انسانیت کو کیسے
بحال کیا جائے ...... مگر بیٹے کافی دیر ہو چکی ہے۔ اب
جاؤ، پھر کل باتیں کریں گے ......"

رضوان تو چاہتا تھا کہ ہاتھ میں ایک مشعل لے کر اٹھے اور سارے فسادیوں کے گھر کو آگ لگا دے۔ ان فسادیوں نے کئی گاؤں کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ غور کرنے پر رضوان خود کو بے بس پاتا۔ اسے معلوم تھا کہ لمبی لمبی ڈینگیں ہانکنا اور بات ہے جبکہ فسادیوں کا مقابلہ کرنا ایک دشوار گزار عمل۔ کبھی وہ سوچتا کہ محلوں کے اوباش چھوکروں میں شامل ہو کر وہ اپنی سوچ کو ایک تحریک کی شکل دے۔ اسے پھر اپنے خاندانی وقار کا خیال آتا اور وہ سرد پڑ جاتا۔ وہ سوچتا کہ اس طرح کا اقدام تو خود ہی فساد برپا کرنے کے برابر ہے پھر یہ کہ ایسا کرنا محض ایک رد عمل ہے، مسئلے کا حل نہیں۔

اسی نوع کی متضاد سوچ میں ڈوبا وہ پروفیسر صابر علی کے گھر سے نکل کر باہر سڑک پر آچکا تھا۔ رات کا منظر تھا۔ دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ اکثر ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ جب بھی فساد ہوتا ہے تو اس کا اثر شہروں پر کچھ یوں ہوتا ہے کہ دکانیں دیر رات تک کھلی نہیں رہتیں، ہو سکتا ہے فساد کا عفریت چہل قدمی کرتا ہوا آجائے اور دکانوں پر حملہ کر دے۔ اس عمل میں زیادہ تر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو لوٹ کا مال ہتھیانے میں تیزی دکھاتے ہیں۔ موسم فساد میں یہ لوگ اتنا اکٹھا کر لیتے ہیں کہ مہینوں اپنے گھر بیٹھے کھاتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو ان فسادیوں کے پیٹ کیسے بھریں گے۔؟ انھیں یہ لیڈر اپنی جیبوں سے تھوڑی نا دیتے ہیں۔ ان دونوں کو ایک

دوسرے کی پشت پناہی ضرور حاصل رہتی ہے۔ دونوں ہی مل کر دیش کی نیّا کھیتے ہیں...... رضوان بڑی تیزی سے سڑک پر چلا جارہا تھا۔ کہیں کونے میں ایک گمٹی کا تھوڑا ساپٹ کھلا تھا۔ اندر ڈبیہ جل رہی تھی۔ اس میں دکان بھی تھی اور رہائش بھی۔ اس دکان سے رضوان نے سگرٹ لی اور سلگا کر کش لیتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اس وقت اس کا ذہن مشین کی طرح چل رہا تھا۔ کمرے پر آکر اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ اسٹو جلا کر کھچڑی بنا کر کھائی اور نماز عشاء ادا کی۔ آخری سجدہ کرتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس کی پیشانی آگ کی کسی بھٹی میں چلی گئی ہے۔ اس کے دماغ میں فساد کا نقشہ اب بھی گھوم رہا تھا۔ اس کا چہرہ نماز کے بعد بھی تمتما رہا تھا۔ اس نے امن وسکون کے لیے طویل دعا مانگی۔ اسے جب اطمینان سا محسوس ہوا تو اس نے ایک اردو رسالہ ہاتھ میں اٹھالیا اور بستر پر آگیا۔ کچھ پڑھتا کچھ سوچتا۔ دیوار پر لگی مونا لیزا کی شیریں اور پرکشش مسکراہٹ بھی اسے زہر آمیز محسوس ہورہی تھی۔ رسالے کی اوراق گردانی، اُدھیڑبن، مونا لیزا کی مسکراہٹ، ان تینوں کے بیچ بیچارے رضوان کا وجود کب نیند کی گود میں چلا گیا کسی کو پتہ نہیں، البتہ رات کی پُراسرار تاریکی اور خموشی اس کی گواہی دے سکتی تھی۔

زیبا کلیم اپنے گھر پر ناشتے کے بعد تازہ اخبار دیکھتی جارہی تھی۔ وہاں اس کے ڈیڈی چودھری کلیم الدین اردو روز نامہ قومی تنظیم پڑھ رہے تھے۔ جب وہ اس خبر پر پہنچے تو رک گئے۔

"سیتا مڑھی فساد زدگان کو امداد کی ضرورت۔ امارت شرعیہ، جمعیۃالعلماء ہند اور دوسری تنظیمیں فلاحی کاموں میں پیش پیش"

"بیٹی! یہ دیکھو سیتا مڑھی میں جو فساد ہوا ہے، مسلمان وہاں بری طرح تباہ ہوئے ہیں۔ ان کے گھروں کو جلایا گیا ہے۔ ان کے لیے امداد کی اپیل کی گئی ہے۔ ہمیں بھی اس میں حصہ لینا چاہیے ...."

"اوہ ڈیڈ! آپ تو ایسی باتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ اس طرح فساد والوں کے لیے اپیل تو ہمیشہ ہی ہوتی رہتی ہے ...... "Leave it Dad"

زیبا کی اس بے پروا گفتگو کا چودھری کلیم الدین پر منفی اثر ہوا۔

انھیں شاید اس کا اندازہ نہیں تھا کہ ان کی بیٹی تیز طرار ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی بے حس بھی ہے اور انسانی ہمدردی سے خالی بھی۔ انھوں نے حکمیہ انداز میں یہ رائے قائم کی کہ ہمیں بھی اپنی فیکٹری کی طرف سے اس میں حصہ لینا ہے۔ پہلے تو زیبا باتوں کو خوبصورت موڑ دے کر موضوع بدلنے کی کوشش کرتی رہی مگر چودھری صاحب نے بھی ٹھان رکھی تھی کہ آج ان کی بیٹی زیبا کی ضد نہیں چلے گی بلکہ ان کی اپنی ضد چلے گی۔ آخر کار زیبا کلیم نے چار وناچار حامی بھرلی......

"ٹھیک ہے ڈیڈی آپ جب اتنے Rigid ہیں تو ہم بھی کچھ کپڑے اور کھانے کے Packages وغیرہ لے کر چلیں گے۔"

"شاباش بیٹی...... تم کتنی سمجھدار ہو۔ اچھا یہ بتاؤ کے ہماری فیکٹری سے کون کون جاسکتا ہے جو سوجھ بوجھ رکھتا ہو"۔

چودھری کلیم الدین نے زیبا سے دریافت کیا۔

"سلجھا ہوا تو خالد امام اور اشوک ہے۔ ہاں یاد آیا ڈیڈ! خالد کا ایک دوست رضوان ہے جو ہر دم سماجی رکھ رکھاؤ اور انسانی ہمدردی کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ بڑا سوشل نظر آتا ہے۔ خالد اسے بھی ساتھ لے کر چل سکتا ہے"

زیبا نے جواباً عرض کیا۔

چودھری کلیم نے تجویز رکھی۔

"میرے خیال سے اشوک کو چھوڑ کر رضوان کو ہی لے چلو۔ خواہ مخواہ اشوک کی وجہ سے ایک طرح کی بندش

بھی رہے گی۔ اور پھر یہ کہ چار آدمی کافی ہیں......"
"ڈیڈا شوک بڑا اچھا لڑکا ہے، بالکل سیکولر۔ کبھی ہندو مسلم کی بات کرتا ہی نہیں۔اسے تو بابری مسجد کے Demolition کا دکھ آج بھی ہے"۔
"بیٹی دکھ تو انھیں بھی ہے جنہوں نے اس عمل میں حصہ لیا اور مسجد شہید ہو جانے کے بعد مٹھائیاں تقسیم کیں۔ یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے بیٹی جو تمہاری سمجھ سے باہر ہے۔ ایسے بھی ہمیں جتنے افراد کی ضرورت ہے پورے ہو گئے......"

زیبا نے مزید کوئی بحث نہیں کی۔ آج یہ طے ہو گیا کہ گارمنٹس فیکٹری سے فلاحی ٹیم جائے گی۔ زیبا نے آفس پہنچ کر خالد کو بلا کر مطلع کیا کہ آج ہی شام سیتامڑھی کے لیے فلاحی ٹیم روانہ ہو گی۔ خالد کو تعجب بھی ہوا کہ زیبا کی طبیعت سے اس اقدام کا کوئی جوڑ نہیں مگر جب زیبا نے راز فاش کیا تو خالد سمجھ گیا۔ زیبا نے کہا:

"حالاں کہ میں ایسے کاموں میں وقت برباد کرنے کے Favour میں نہیں تھی مگر پتہ نہیں آج ڈیڈی کو کیا ہو گیا، ایک دم سے Rigid ہو گئے۔ ان کا خیال تو ہمیں رکھنا ہی پڑے گا...... اور ہاں خالد اس دن جو تمہارا دوست رضوان آیا تھا، اسے بھی ساتھ لے سکتے ہو تو لے لو...... ہماری ٹیم بھی مکمل ہو جائے گی اور اس بیچارے کے دل کی بھڑاس بھی نکل جائے گی۔ فساد کا منظر اسے قریب سے دیکھنے کو ملے گا...... بیچارہ رضوان!"

اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ خالد امام رضوان کو

خبر کرنے چلا گیا۔

تین بجے سے پہلے پہلے سب تیاریاں کرلی گئیں۔ایک گاڑی پر کھانے پینے کی چیزیں، کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں رکھ لی گئیں۔ کلیم الدین چودھری، زیبا، خالد اور رضوان ساتھ چلنے کو تیار تھے۔ کلیم الدین چودھری اور زیبا اپنی نجی کار میں تھے۔ بروقت خالد نے مشورہ دیا ------

"میرے خیال میں اس ماحول میں زیبا کا جانا مناسب نہیں ہے"۔

کلیم الدین چودھری نے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا۔خالد کی بات پر انھیں بھی ذرا تکلف ہوا اور انھوں نے بھی حامی بھری کہ زیبا یہیں رہ جائے۔ مگر زیبا کب ماننے والی تھی......

"نہیں ڈیڈی میں بھی چلوں گی۔ میں یہاں اکیلے بوریت محسوس کروں گی اور پھر یہ کہ میرا وہاں جانا کیوں مناسب نہیں ہے؟"

رضوان نے بھی دبے لفظوں میں کہا......

"دیکھو اس ماحول میں کب کیا ہو جائے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ تمہاری موجودگی سے ہم لوگ بھی کمزور ہو جائیں گے۔"

زیبا نے احتجاج کیا......

"گویا میں اس ٹیم پر بوجھ بن جاؤں گی۔ مگر جو بھی ہو، میں چلوں گی۔ خواہ مخواہ آپ لوگ Female Class کو کمزور سمجھتے ہیں۔"

کلیم الدین چودھری نے بھانپ لیا کہ زیبا کی ضد پوری کرنی ہوگی نہیں تو وہ کچھ اور رد عمل ظاہر کرے گی۔

"ٹھیک ہے بیٹی چلو، کچھ بھی نہیں ہوگا"۔

۵

ریلیف ٹیم سات بجے شام ریگا پہنچ گئی۔ یہ علاقہ شوگر مل کی وجہ سے کافی دور تک مشہور ہے۔ مل کا وسیع و عریض احاطہ اور اس میں گنّے سے لدی ہوئی ہزاروں بیل گاڑیاں، ان گنت ٹرک۔ آس پاس مل سے نکلے ہوئے فضلات اور ایک عجیب قسم کی بو پورے ماحول پر چھائی ہوئی۔ چوک پر چھوٹی چھوٹی دکانوں اور چائے خانوں کی قطاریں۔ یہاں بیشتر گھاس پھوس کی بنی دکانیں ہیں۔ ضرورت کی تمام چیزیں اس چوک پر مل جاتی ہیں۔ پکّی سڑکیں جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئیں۔ یہاں ایک پولس چوکی بھی ہے۔ اس چوک پر ہمیشہ گہما گہمی اور رونق رہتی ہے۔ مگر آج عجیب سا سناٹا چھایا ہوا ہے جیسے پوری فضا کو زہریلا سانپ سونگھ گیا ہو۔ بیشتر دکانیں بند ہیں۔ آج تو لوگوں کی چہل پہل بھی نہیں ہے۔ اکا دکا لوگ نظر آرہے ہیں۔ وہ بھی ڈرے سہمے ہوئے۔

ریلیف ٹیم نے اسی چوک پر اپنا خیمہ نصب کیا اور کچھ ریلیف کا کام بھی اسی وقت کیا گیا۔ وہاں رضوان کو اس کا ایک پرانا دوست سہیل مل گیا۔ سہیل نے ریلیف ٹیم کی رہنمائی کی۔ سہیل اور رضوان کے درمیان گفتگو ہونے لگی۔

رضوان: سہیل یہاں چوک پر مسلمانوں کی کتنی دکانیں ہوں گی؟

سہیل: ایسے یہاں غیر مسلموں کی آبادی زیادہ ہے مگر مسلمانوں کی آبادی بھی اچھی خاصی ہے۔ یہاں مسلمانوں کی سولہ دکانیں تھیں جنھیں صبح ہی میں جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ ایک مشہور پیسے والا آدمی کھناری انصاری تھا وہ سامنے (اشارہ کرتے ہوئے) اسی کی دکان تھی۔ پہلے تو اس کا بورڈ اکھاڑا گیا پھر لوٹ پاٹ کر کے سب کچھ جلا دیا گیا۔

رضوان: اور بھی نقصان ہوا ہے؟ میرا مطلب جانی نقصان بھی ہوا ہے؟

سہیل: دن میں تو تیرہ سائیکلوں اور دو موٹر سائیکلوں کو یہیں چوک پر جلا دیا گیا۔ جو لوگ بھاگ نہیں سکے انھیں بے دردی سے پیٹا بھی گیا اور چوری چھپے قتل کی واردات بھی ہوئی ہیں۔"

یہ گفتگو بھی راز دارانہ ہو رہی تھی۔ اب لوٹ مار اور شعلوں کی بارش کرتا ہوا فسادیوں کا جتھہ جا چکا تھا۔ مگر گھر گھر سے رونے بلکنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔ سہیل آج خیمے ہی میں رہ گیا تھا۔ ایک خبر اڑی کہ ایک مسلمان رکشا چالک کو چھرا گھونپ کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔ اس طرف بہت شور وہنگامہ تھا۔ رضوان اور سہیل اسی طرف بڑھے۔ محلے میں ایک جگہ چند لوگ اکٹھا ہو کر طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ وہاں دو معصوم بچیاں رو رہی تھیں۔ بغل میں چٹائی پر ایک ۳۵ سالہ شخص کی لاش پڑی تھی جس کے سینے اور پیٹ سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ چہرے پر کئی جگہ چھرے کے لگے ہوئے زخم تھے۔ یہ منظر دیکھ کر

رضوان کے دل میں طوفان سا اٹھنے لگا۔ ایک بوڑھی عورت کہہ رہی تھی:

"اب ایکر دیکھ بھال کون کری۔ باپ کے تے ای ہنوا سب ماردے لس"

دو بچیاں شہناز اور مہناز اسی مرنے والے رکشا چالک کی تھیں۔ ماں چند سال قبل مرچکی تھی۔ باپ ہی ان بچیوں کے لیے سب کچھ تھا۔ آج ان کا آخری سہارا بھی فسادیوں نے چھین لیا۔ رضوان نے سوچا کے کاش یہ منظر زیبا بھی دیکھ لیتی۔ تاکہ اسے یہ سمجھ میں آجاتا کہ آج انسانیت کا قتل کس بے دردی اور بے رحمی سے ہورہا ہے۔ سہیل نے رضوان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے تسلی دی۔ سہیل کو معلوم تھا کہ رضوان اپنے اسکول کے زمانے سے ہی بہت حسّاس واقع ہوا تھا۔ دونوں یہ دل دوز منظر دیکھ کر واپس آگئے۔ سہیل خیمے سے دور اپنے ایک دوست اُمیش کے گھر سونے چلا گیا۔ اسے اپنے دوست پر پورا بھروسہ تھا۔ اس نے اپنی بیوی بچے کو پہلے دن کے فساد کے بعد ہی میکے پہنچادیا تھا۔ رضوان خیمے میں آکر خالد کے ساتھ سوگیا۔ زیبا ادھر اپنے والد کلیم الدین چودھری کے ساتھ آرام کر رہی تھی۔ کار کا ڈرائیور کار ہی میں سو گیا تھا۔ ٹرک کا ڈرائیور ٹرک پر ہی سو رہا تھا جس پر ریلیف کا سامان لدا ہوا تھا۔

رضوان کروٹیں بدل رہا تھا۔ آج اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ آخر کار وہ خیمے سے نکل کر باہر آگیا۔ اس کی نظر شوگر مل کے احاطے میں ہزاروں بیل گاڑیوں اور ٹرکوں پر گئی۔ چاندنی رات ایسے خاموش تھی جیسے کسی بے رحم شوہر نے شب زفاف میں اپنی دلہن کے سینے میں خنجر پیوست کردیا ہو۔ آسمان پر تارے ٹمٹمارہے تھے۔ رضوان نے جیب سے سگرٹ نکال کر سلگائی اور کش لینے لگا۔ اس کے پردۂ ذہن پر ہندوستان کے

مستقبل کا ایک کریہہ منظر ابھرا۔ اسے ایک بار کھانسی ہوئی۔ زیبا بھی شاید ابھی جاگ رہی تھی۔ ہوسکتا ہے اس ماحول سے خائف ہویا پھر وہ بھی حالات کو اپنے ذاتی احساس سے ہم آمیز کرنے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔ کھانسی سن کر زیبا نے اپنے خیمے سے باہر جھانکا۔ رضوان کا جسم اسے پیچھے سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دودھیا چاندنی میں سگرٹ کا دھواں محلول ہوتا ہوا صاف نظر آرہا تھا۔ زیبا نے باہر آکر پوچھا:

''کون ہے وہاں......؟''

ایک خاموشی غالب رہی۔ زیبا نے جب قریب آکر پوچھنا چاہا تو رضوان اس کی طرف مخاطب ہوا۔ زیبا نے اسے اس وقت یہاں دیکھ کر پوچھا:

''تم......؟ یہاں اکیلے؟...... اس وقت؟''

جیسے خاموش جھیل پر کوئی بچہ کنکر مار دے اور سطح آب پر موجوں کی زنجیریں بنتی ہوئی آغوش ساحل میں سما جائیں۔ رضوان اب بھی اپنے ذہن میں پیدا شدہ گتھیوں کو سلجھانے میں لگا تھا۔ تھوڑے توقف کے بعد وہ زیبا سے ہم کلام ہوا:

''زیبا تم آسمان پر چمکتے ان ستاروں کو دیکھ رہی ہو؟''

''ہاں میں دیکھ رہی ہوں، مگر کیوں؟'' زیبا نے جلدی سے کہا۔

''کتنی خوبصورت ہے ان ستاروں کی دنیا اور کتنی بدصورت ہے ہماری دنیا، کاش ہم بھی ستارے ہوتے؟''

رضوان کی نگاہیں آسمان کی طرف اب بھی لگی ہوئی تھیں۔ سگرٹ کا دھواں فضاؤں میں بکھر رہا تھا اور یہ عمل رضوان کے لیے ایسا تھا جیسے کوئی شخص اپنے مسائل اپنے دوست کے سامنے بیان کرکے خود کو ہلکا

محسوس کرتا ہو۔ ہو سکتا ہے رضوان کے مسائل بھی سگرٹ کے دھوئیں کے ساتھ مناسب حل کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ ہو سکتا ہے، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

"آخر تمہارے کہنے کا مطلب کیا ہے۔ تم تو فلاسفر جیسی باتیں کر رہے ہو" زیبا کچھ بیتاب سی نظر آرہی تھی۔

"دیکھو نا دنیا کسی مانگ اجڑی دلہن کی طرح بیوہ نظر آرہی ہے۔ آسمان پر تو سب خیریت ہے، مگر یہاں زمین پر، آخر تم بھی تو سمجھ سکتی ہو، کہاں کسی کو ایک پل سکون ہے۔ اسی لیے میں نے کہا ہے کہ کاش ہم بھی ستارے ہوتے ......"

رضوان بے سر پیر کی باتیں کیے جارہا تھا گرچہ ان کی اپنی معنویت بھی تھی ۔ دراصل وہ بے صوت وصدا احساس کے حصار میں تھا۔ زیبا اس کی ہر بات اور ہر لفظ کی تہ میں اتر جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"دراصل تم ابھی کسی طرح کے جاب سے لگے نہیں ہو اس لیے ذہن میں ایسی باتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ فیوچر کو اگر تم برائٹ دیکھنا چاہتے ہو تو سرکاری جاب کا چکر چھوڑ کر پرائیویٹ جاب جوائن کرلو"۔

زیبا نے جیسے رضوان کی ذہنی پریشانیوں کا حل ہی پیش کر دیا۔ رضوان نے بے دلی سے کہا......

"اتنی آسانی سے پرائیویٹ جاب بھی تو نہیں ملتی"۔

اس گفتگو کے بعد دونوں خیمے میں آگئے۔ صبح کے وقت زیبا نے اپنے والد سے کہا......

"ڈیڈی ایک بات کہنا چاہتی ہوں"

"کون سی بات ہے؟"

"یہ رضوان نیک لڑکا معلوم ہوتا ہے۔اب تک بے روزگار ہے۔اگر آپ کی اجازت ہو تو اسے اپنی فیکٹری جوائن کرالوں"

کلیم الدین چودھری نے خفیف سی مسکراہٹ کے بعد کہا:

"بیٹی اگر تم سمجھتی ہو کہ یہ مناسب ہے تو میں انکار کب کرسکتا ہوں۔ پھر یہ کہ فیکٹری کی ترقی کے راستے تمہیں بہتر معلوم ہیں"۔

"تھینک یو ڈیڈ، تھینک یو ویری مچ" زیبا نے فرط خوشی میں اپنے والد کے ہاتھوں کا بوسہ لے لیا۔ اسی درمیان رضوان بھی اس طرف آ گیا۔

"آؤ رضوان، ابھی تمہاری ہی بات ہو رہی تھی"

کلیم الدین چودھری نے بشاشت کے ساتھ کہا۔

رضوان نے ریلیف کا کام کرنے کی بات رکھی......

"میرے خیال میں کل جو بربادی ہوئی ہے اس کے پیش نظر ہمیں ریلیف کا کام جو رہ گیا ہے اسے کرلینا چاہیے۔ ضرورت مندوں کو اگر دیر سے کچھ دیا بھی گیا تو کیا حاصل......"

"ہاں تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ ہم لوگ ابھی یہ کام کریں گے۔" اس سے پہلے تمہارے سلسلے میں ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ زیبا ابھی تمہارا ہی ذکر کر رہی تھی۔ اگر تمہیں کوئی پریشانی نہ ہو تو ہماری فیکٹری میں بلا تکلف

جاب کرسکتے ہو۔"

کلیم الدین چودھری نے مشفقانہ اور ہمدردانہ انداز میں یہ بات کہی۔ زیبا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ مگر رضوان کے ذہن میں اس وقت فساد اور اس کے متاثرین کا نقشہ ابھر اور مٹ رہا تھا۔ اس لیے کلیم الدین چودھری کے اس آفر سے اسے بہت زیادہ خوشی نہیں ہوئی تاہم اس نے نرمی سے کہا:

"یہ تو آپ کی شفقت اور محبت ہے"

زیبا نے شوخی بھرے لہجے میں کہا:

"رضوان آج سے تمہاری نوکری پکّی، ریلیف کے کام سے فری ہو کر جلد ہی ہم لوگ پٹنہ بیک (Back) ہوں گے ۔ دیکھنا رضوان اس فیکٹری میں تمہیں بڑا مزا آئے گا!" --------

رضوان نے اپنی طرف سے کسی طرح کی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔
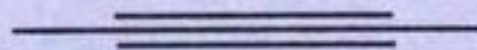
دس بجے تک ریلیف کا سارا سامان ٹھیک کرلیا گیا۔ پنچھور، بکھری، ایجورہیا، اور منجھورا گاؤں کی فہرست سازی کرلی گئی تھی۔ اس کام میں سہیل نے بڑی مدد کی تھی۔ یہ سارے گاؤں دو کیلو میٹر کے فاصلے پر آباد تھے۔ سہیل کی ان گاؤں کے تقریباً نوے فی صد لوگوں سے پہچان تھی۔

جمعرات کا دن تھا۔ رات کے فساد اور گھروں کو نذر آتش کیے جانے کی دہشت ابھی تازہ تھی۔ کلیم الدین چودھری، زیبا، رضوان، خالد اور سہیل ریلیف کے کام میں مصروف تھے۔ آس پاس امارت شرعیہ، برونی اور بھاگل پور سے آئی ہوئی ریلیف جماعتیں جگہ جگہ کام کررہی تھیں۔ پہلے متاثرین کی فہرست سازی کی جاتی پھر یکے بعد دیگرے نام پکارا جاتا، چاول، دال، ڈبل روٹی، ساڑیاں، کمبل اور دوسری ضرورت کی چیزیں تقسیم کی جاتیں۔ بیشتر لوگوں کی آنکھیں کرب آگیں تھیں۔ کچھ لوگوں کی آنکھیں شب بیداری اور بے خوابی یا پھر گریہ وزاری سے سوج گئی تھیں۔ کچھ شیر خوار بچے ماں کی چھاتیوں سے لگ کر بھی بلک بلک کر رو رہے تھے کہ بھوک اور خوف سے دودھ واپس اپنے مراجع میں جا چکا تھا۔

اچانک ایک طرف سے شور اٹھا۔ شور وہنگامہ برپا کرتا ہوا یہ قافلہ

شوگر مل چوک سے بکھری کی طرف بڑھا اور پھر گنیش پور تک چلا گیا۔ وہاں سے یہ قافلہ کسی ایسے محفوظ مقام پر چلا گیا ہوگا جہاں اس کا بھرپور استقبال ہوا ہوگا۔ اس بار اس قافلے کی زد میں رضوان کے دوست سہیل کا گھر بھی آگیا۔ بکھری میں پہلے اسی کا گھر جلایا گیا۔ وہ آرکسٹرا میں رفیع سنگر کی حیثیت سے کام کر کے اپنے خاندان کی کفالت کیا کرتا تھا۔

اس ہنگامے سے رضاکار تنظیمیں ڈر گئیں۔ جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ ریلیف کا کام آج نہ ہوگا کل ہوگا اور اگر نہ بھی ہوا تو کیا فرق پڑتا ہے۔ جس کا سب کچھ لٹ جاتا ہے اس کے لیے ریلیف ٹیم کیا کر سکتی ہے۔ اسی موقع کے لیے شاید کہا گیا ہے کہ تھوک چاٹنے سے کہیں پیاس بجھتی ہے؟ اس لیے اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالی جائے۔ یہاں تو سرکاری عملہ اور سرکاری ذمہ داران خود فساد کراتے ہیں اور ریلیف کے نام پر پھر اپنی جیبیں بھی گرم کرتے ہیں۔ جیسے فساد نہ ہوا عیش کا ترانہ ہوا۔

کلیم الدین چودھری، زیبا، رضوان سب پریشان تھے۔ زیبا خیمے میں لوٹنا چاہتی تھی۔ خیمہ گرچہ بہت دور نہیں تھا مگر اس وقت کہیں جانا مناسب بھی نہیں تھا۔ اب بھی لوگ گنیش پور کی طرف سے بھاگ رہے تھے۔ کچھ عورتیں گود میں شیر خوار بچوں کو لیے چیختی ہوئی بھاگ رہی تھیں۔ کچھ مرد دو دو، تین تین بچوں کو کندھے پر بٹھائے اور ان میں سے کچھ کی انگلیاں پکڑے ہوئے بلکہ انھیں گھسیٹتے ہوئے بھاگے جا رہے تھے۔ رضوان بے چین تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ گنیش پور جا کر صورتحال کا جائزہ لیا جائے۔ مگر سبھوں نے اسے منع کر دیا۔ بھاگنے والوں میں سے ایک نے بتایا کہ گنیش پور میں کافی لوگوں کو مار دیا گیا ہے۔ ایک روتی ہوئی عورت کہتی جا رہی تھی کہ وہاں کے مسجد کے امام صاحب کو بھی مار دیا گیا ہے۔ یہ سن کر

رضوان اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتا۔ وہ گنیش پور پہنچ کر لوگوں کی مدد کرنا چاہتا ہے۔

سبھوں کے منع کرنے کے باوجود وہ گنیش پور کے لیے روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ امام صاحب کو مار کر ان کے دونوں کان کاٹ لیے گئے ہیں۔ ایک ہلواہا کھیت سے آرہا تھا اسے راستے ہی میں مار کر وہیں کھیت میں جلادیا گیا۔ اس بے چارے رحمت علی انصاری کو جنازہ نصیب نہ ہوسکا۔ اس پچاس سالہ ہڈی میں اتنی قوت بھی نہیں تھی کہ فسادیوں کے سامنے کچھ بھی مزاحمت کرسکتی۔ وہ جیسے تیسے مزدوری کرکے اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ پالا کرتا تھا۔ دو بیٹے شادی کے بعد اپنی اپنی بیوی کے ساتھ الگ رہنے لگے تھے۔ نو سالہ انگوری کی لاش ابھی اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اس معصوم انگوری کو بھالے سے چھید چھید کر ہلاک کردیا گیا تھا۔ اسے مارنے والا اس کا پڑوسی رامیشور ساہ تھا۔ انگوری اسے چچا جی کہہ کر پکارا کرتی تھی۔ اس طرح ۴۵ سالہ سلیمان کی گردن پر وار کرکے اسے بھی آخری نیند سلادیا گیا تھا۔ چودہ سالہ علاء الدین جو ابھی ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھا، اس کے سامنے دنیا کے نشیب وفراز تھے اور کہتے ہیں کہ طالب علم ملک کا مستقبل ہوتا ہے، آج اسی مستقبل کو فسادیوں نے بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتاردیا تھا۔ اب موت کا عفریت اپنا گھناؤنا رقص دکھاکر جاچکا تھا۔ رضوان وہیں کسی کے دروازے پر ایک جیپ میں لگی آگ بجھانے لگا۔ اسی درمیان پولیس آگئی۔ پولس کی گاڑی دیکھ کر کئی لوگ کھسک گئے۔ بھاگنے والوں میں سے ایک شخص نوازی پکڑ لیا گیا۔ رضوان اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ پولس نے جب اسے گرفتار کرنا چاہا تو اسے حیرت ہوئی۔ اس نے صفائی پیش کی:

"دیکھیے سر! ہم لوگ تو جیپ میں لگی آگ بجھا رہے تھے"

"سر کے بچے جھوٹ بولتا ہے۔ میں خوب جانتا ہوں۔ تم لوگ دنگا کر کے دیش کو اور دیش کی طاقت کو کھوکھلا کرتا ہے"۔

ایک بیہودہ قسم کے پولس افسر نے رضوان کا گریبان پکڑتے ہوئے کہا۔

"سر! آپ تو خواہ مخواہ الزام دے رہے ہیں۔ میں تو پٹنہ سے ریلیف کا کام کرنے آیا ہوں۔ میں نے پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا ہے۔ میرے کئی دوست بی پی ایس سی کر کے ڈی ایس پی اور ڈپٹی کلکٹر بن چکے ہیں۔"

"ای سالا تو بڑی گولی دے رہا ہے۔ سالا پڑھا لکھا دنگائی ہے، لے چلو اسے ......"

انسپکٹر نے رضوان کو ایک کانسٹبل کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

رضوان اور نوازی کو سیتامڑھی حوالات میں پہنچا دیا گیا۔ حوالات میں نوازی اور رضوان میں جان پہچان ہو گئی۔

رضوان : معاف کیجیے۔ آپ کا نام کیا ہے ؟

نوازی : ہمارا نام نواجی ہے اور آپ کا ؟

رضوان : مجھے رضوان کہتے ہیں؟

نوازی : آپ کہاں سے آئے ہیں؟

رضوان : میں پٹنہ میں پڑھتا ہوں۔ وہیں سے ہم لوگ ریلیف کا کام کرنے آئے تھے۔

نوازی: ایک بات کہیں بابو صاحب!

رضوان : ہاں، ضرور کہیے!

نوازی: آپ کو اس میں پڑنے کی کا جرورت تھی؟ آپ تو بیکار میں دھرا گئے۔

رضوان : نہیں نوازی بھائی۔ یہ تو ہمارا فرض ہے۔ اگر ہر آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہ جائے تو اس ظلم کے خلاف کون لڑے گا؟

نوازی: اُو تَ ٹھیک ہے بابو صاحب! مگر ایہاں سب کے سب تماسے دیکھتے ہیں۔ ہم تَ کہتے ہیں کہ ای سب نیتا لوگ ہی کرتا ہے۔" اسی درمیان دونوں کی سرگوشی سن کر ایک پولس والا اس طرف آگیا۔

پولس: کیا نیتا لوگ کرتا ہے۔ ابھی دو چار ڈنڈا سے تم دونوں کا پیٹ نہیں بھرا ہے!

رضوان : دیکھیے، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

سپاہی: اچھا، ہم کو ہی کہتا ہے جے گلط پھھمی ہوا ہے۔ ارے صاف صاف کیوں نہیں کہتا کہ ای سب پر بھوناتھ جھا کرواتے ہیں.......... چُٹّی والے، سالے، کتّے، کرتا ہے دنگا آبھاسن دیتا ہے...... ہے! ایک دم سے چپّے رہو، اب جو بولو گے تو دیکھتے ہو ای گونجی (لاٹھی)"

دونوں اس وقت کسی مصلحت کے تحت چپ ہو رہے۔ اسی درمیان پر بھوناتھ جھا پولس چوکی آگئے۔ ایک طرح کی کھلبلی سی مچ گئی۔ تھانہ انچارج اپنی کرسی چھوڑ کر استقبال کو دوڑ پڑا۔ پولس کا سارا عملہ چوکنا

ہو گیا۔ جھاجی آکر بڑی تمکنت سے کرسی میں سماگئے۔ موٹے اتنے تھے کہ مشکل سے سما پا رہے تھے۔ بلکہ انھوں نے کہا بھی......

"کا پر بھاری جی، ای کیسا کرسی رکھتے ہیں۔ کاہے کنجوسی کرتے ہیں؟"

پر بھاری جی صرف بے وقوف جیسے مسکرا کر رہ گئے۔ البتہ انھوں نے ایک شخص کو بلا کر کان میں کچھ کہا اور پانچ منٹ کے اندر طرح طرح کی مٹھائیاں آگئیں اور دستر خوان چن دیا گیا۔ نوازی نے پہچان لیا کہ جھاجی آگئے۔ اسے ایسا لگا جیسے جھاجی اسے ابھی حوالات سے آزاد کرا کے لے جائیں گے۔ اس نے رضوان سے کہا......

"رجوان صاحب جھاجی سے سکایت کرتے ہیں وہ جرورے ہم کو چھڑا لیں گے۔"

رضوان نے بے دلی سے کہا......

"نوازی بھائی نیتاجی کو آپ سے کیا مطلب؟"

اس پر نوازی نے فخریہ انداز میں کہا:

"رجوان صاحب! ان کے چناؤ میں ہم بڑا کام کیے تھے۔ کہاں کہاں جا کے بھوٹ چھاپے تھے۔"

لیکن سب کچھ کے باوجود رضوان کو بخوبی اندازہ تھا کہ سیاسی رہنماؤں کو ووٹ لینے کے بعد عوام سے کم ہی رابطہ رہ جاتا ہے۔ البتہ کچھ ایسے پکے چمچے یا پھر غنڈے ہوتے ہیں جن کی بیساکھی پر دو سال، چار سال یا پانچ سال ان رہنماؤں کی رکنیت یا وزارت چل جاتی ہے۔ نوازی نے آواز لگائی۔

نوازی: جھاجی......... جھاجی ہو، سنتے ہیں جھاجی!

رضوان: نوازی بھائی کیوں اپنا گلا خراب کرتے ہیں وہ آپ کی مدد نہیں کریں گے۔

نوازی: نہیں رجوان بھائی وہ اگر دیکھ لیں گے تت جرورے آئیں گے۔

رضوان: دیکھ نہیں رہے ہیں وہاں مٹھائیوں کا دور چل رہا ہے اور سب کیسے ٹھاکا لگا کر ہنس رہے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے پورے شہر میں کسی جیت کا جشن منایا جارہا ہے۔

نوازی: جھاجی !(تیز آواز میں)

اسی درمیان وہ کانسٹبل آگیا جس نے دونوں کو ڈانٹ کر چپ کرایا تھا۔

پولس: کیا ہے؟ کیا جھاجی جھاجی کیے جارہا ہے؟ چپ رہو!

نوازی: سپاہی جی ! او جھاجی ہم کو اچھے سے جانتے ہیں آپ ان کو میرا نام بتادیجیے۔

پولس: ہاں ہاں کیوں نہیں...... بتادیتے ہیں جے نواجی نواب صاحب آپ کو یاد کررہے ہیں جھاجی...... یہی نا......!

نوازی: ہم نواب کا بات نہیں کرتے ہیں۔ ان کو بتادیجیے جے گنیس پور کا نواجی ایہاں حوالات میں ہے۔

پولس: چپ بے ! بکے جارہا ہے بکے جارہاہے۔ آیا بڑا لاٹ صاحب۔ جھاجی کو تم جیسے غنڈوں اور دنگائیوں سے کیا مطلب؟

رضوان نے ہمت جتاتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی۔ حالاں کہ اسے معلوم تھا کہ یہ پولس آسانی سے سمجھ نہیں پائے گی۔

"دیکھیے اگر یہ کہتے ہیں تو جھاجی کو آپ جاکر ان کا نام
بتادیجیے۔ ہو سکتا ہے وہ ان کو اچھی طرح جانتے ہوں"

پولس: اچھا...... تو سپھارس کرتا ہے۔ جھاجی کوئی معمولی آدمی ہیں۔ اب دونوں چپ رہو۔ ہم کو ڈیوٹی کرنے دو۔ وہ دیکھو اب جھاجی جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب کیا کروگے ؟"

نوازی کو بے حد صدمہ ہوا۔ اسے پورا یقین تھا کہ جھاجی اسکی مدد کریں گے ۔ آخر کس دن کے لیے ان کے چناؤ میں اتنی محنت اور بھاگ دوڑ کی تھی...... سب پر آج پانی پھر گیا۔ مگر اس میں جھاجی کا کیا قصور تھا، بدمعاشی تو اس کانسٹبل کی تھی جس نے جھاجی تک بیچارے نوازی کی بات ہی پہنچنے نہیں دی۔

رضوان کو فرق نہیں پڑا کہ اسے نیتاؤں کے بارے میں بہت کچھ معلوم تھا اور جھاجی سے بہت زیادہ قربت بھی نہیں تھی، یہ الگ بات تھی کہ ڈھاکہ میں ان کے لیے کئی بار استقبالیہ گیت بھی لکھ چکا تھا۔ مگر رضوان ان باتوں کو حوالے کے طور پر استعمال کرنا اپنی افتاد طبع اور اخلاق کے منافی تصور کرتا تھا۔
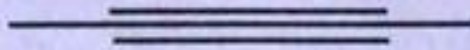
رات کے دس بج رہے تھے۔ پوری کائنات سیاہ چادر اوڑھ کر خواب وحشت کا شکار ہوچکی تھی۔ ریلیف ٹیم اب شوگر مل چوک سے آکر گنیش پور میں خیمہ زن تھی، جہاں دن میں دنگائیوں نے کہرام مچادیا تھا۔ کئی بے قصور لوگوں کو ہلاک کردیا گیا تھا۔ رضوان اسی گاؤں کی طرف شوگر مل چوک سے بھاگا آیا تھا، تب سے غائب تھا۔ سب متفکر تھے۔ رات کی تاریکی اور سناٹے میں خیمہ بھوت گھر معلوم ہورہا تھا۔ خیمے کے اندر لالٹین کی روشنی مدھم تھی۔ گاؤں سے بیشتر لوگ بھاگ چکے تھے اور جو رہ گئے تھے، ڈرے ہوئے، سہمے ہوئے سو رہے تھے یا پھر سونے کی طرح جاگ رہے تھے۔ زیبا اور خالد جاگ رہے تھے۔ کلیم الدین چودھری سوچکے تھے۔ زیبا نے خالد کے خیمے کے پاس آکر آواز دی۔ خالد باہر آگیا۔ خالد کے ساتھ کار کا ڈرائیور بھی سو رہا تھا۔ زیبا اور خالد رضوان کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ دونوں بے خیالی میں خیمے سے ذرا دور نکل آئے۔ آگے کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ زیادہ تر گنّے کی فصل تھی۔ گنّے کے کھیت میں سرسراہٹ ہوئی۔ زیبا اور خالد چوکنا ہوگئے۔ وہاں سے سرگوشی سنائی دی۔ دونوں نے اس طرف کان لگادیے۔

پہلی آواز: راجیس! یہاں جیپ میں لگی آگ بجھاتے ہوئے ایک باہری نوجوان بھی پکڑا گیا ہے۔ اسی گاؤں کا بھاگنے والا ایک میاں (مسلمان) رستے میں بتیاتے جارہا تھا۔

دوسری آواز: ارے جوگندر وہ نوجوان میرا پکا دوست تھا۔ اس نے موتیہاری سے میرے ساتھ ہی بی ایس سی کیا تھا۔ بڑا نیک اور نمازی تھا بیچارہ۔ تم سے تو پرسوتم پور میں بھینٹ ہوئی ہے مگر وہ تو میرا پرانا متر ہے۔ پولس اسے جیپ پر لے جارہی تھی تو میں ریگا مل چوک پر موجود تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ رجوان نے نہیں دیکھا۔ لگتا ہے وہ بھی اپنی جاتی کی سہایتا کو آیا تھا۔

یہ گفتگو سن کر زیبا کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔ اس نے خالد سے دبی آواز میں کہا۔

"خالد یہ تو وہی راجیش لگتا ہے جس کی تعریف رضوان اکثر کیا کرتا تھا"۔

خالد نے تائید کی ...... "ہاں، سوفی صد یہ وہی راجیش ہے، دیکھیے کیسا دنگائی ہو گیا ہے۔ دراصل کچھ تنظیموں نے نئی نسل کے دماغ میں اتنا زہر بھر دیا ہے کہ اچھے سے اچھا آدمی بھی خراب ہو رہا ہے......"

زیبا نے بیتابی سے کہا:

"چلو تو ذرا قریب چل کر پوچھتے ہیں۔ شاید اسے رضوان کے بارے میں اور بھی تفصیل معلوم ہو"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے آگے قدم بڑھایا۔ خالد نے زیبا کا ہاتھ

جلدی سے پکڑ لیا......

"یہ کیا کر رہی ہو تم، کچھ اندازہ نہیں کہ یہ کتنی تعداد میں ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ اس وقت ان پر فرقہ واریت کا بھوت سوار ہے، اسے رضوان سے کیا مطلب؟ چلو خیمے میں چلتے ہیں۔"

دونوں خیمے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ جوگندر کی آواز سنائی دی۔

"راجیس ہم لوگ ریگا اسٹیسن پر کتنے بجے چلیں گے؟"

راجیش نے جواب دیا..........

"ابھی تو یہاں سے نکلنا ٹھیک نہیں ہے۔ رات کے دو بجے پرسوتم پور سے چار پانچ سو لوگوں کا ایک جتھہ آئے گا اس وقت ہم لوگ یہاں سے نکل کر چلیں گے۔ ابھی اگر نکلیں گے تو کوئی دیکھ لے گا۔ وہ دیکھو ریلیف ٹیم کے پھٹے ہوئے ٹینٹ سے لالٹین کی روشنی آرہی ہے۔"

جوگندر نے پھر کہا...... "اگر ابھی چلتے تو اُدھر ہی ٹہلتے! یہاں کھیت میں کب تک بیٹھے رہیں گے۔ چادر بھی پتلا ہے ٹھنڈ بھی لگتا ہے ادھر کہیں آگ سلگا کر تاپتے۔"

راجیش نے تیزی سے جواب دیا...... "دو بجے کے بعد تو آگ ہی سلگانا ہے جتنا تاپنا ہوگا تاپ لینا۔ اب چپ رہو اور اگر بھوک لگی ہو تو میرے تھیلے سے سنگھاڑہ لے کر کھالو۔ بسلری کی بوتل سے پانی پی لو"۔

جوگندر نے اس بات کی وضاحت کی کہ آج پنچھور اور چنڈیہا گاؤں پر حملہ کرنا ہے۔ سامان بھی لوٹیں گے اور مسلم لڑکیوں سے کھیلنے کا اَوسر

بھی ملے گا۔

جوگندر نے راجیش سے کہا......

"ہمیں اور کیا چاہیے، کہو راجیس بھائی، تم ہی اتنی دور سے ایک نیوتا پر جو بھاگے آئے ہو تو کاہے کے لیے؟"

راجیش کا جواب کچھ یوں تھا:

"دیکھو تمہیں جو کرنا ہو کرلینا ہم تو اپنی کیمونٹی کی سہایتا کے لیے آئے ہیں۔ ایسے دنگا فساد میں سب چلتا ہے۔ مگر جوگندر، ساید تمہیں معلوم نہیں کہ مسلم لڑکیوں کی عجت سے کھیلنا آسان نہیں ہے۔ وہ اپنی عجت بچانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ مراد آباد والے دنگا میں اپنی عجت بچانے کی کھاطر مسلم عورتوں نے کنوئیں میں کود کر جان دے دی"

زیبا کے اندر ایک عجیب وغریب تبدیلی پیدا ہوئی ۔ اس نے سوچا .کہ اس دیش میں سیکولرزم کا نعرہ محض ایک کھوکھلا دعوا ہے۔ آج مسلمانوں کو مولی گاجر کی طرح کاٹا جارہا ہے۔ عورتوں کو جنسی ہوس کا شکار ہر محاذ پر بنایا جارہا ہے ۔ اس نے سوچا کہ رضوان کا اس درجہ حسّاس ہونا اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ اسے اپنے والد اور رضوان کے سامنے اپنی بے حسی کے مظاہرے پر ندامت ہوئی اور اس طرح چند لمحوں میں اس نے سب کچھ سوچ لیا۔ نامعلوم طور پر آنسو کے چند قطرے اس کے رخساروں پر ٹپک پڑے۔ وہ خالد کے ٹوکنے پر چونکی۔

دونوں بوجھل قدموں سے خیمے کے پاس آگئے۔ چودھری کلیم الدین بے خبر سو رہے تھے۔ چونکہ ان دونوں نے سرگوشی سنی تھی کہ رات

میں پنچھور اور چنڈیہا پر حملہ ہوگا اس لیے دونوں فکر مند تھے۔ دونوں نے مشورہ کیا کہ انسانی فرض بنتا ہے کہ دونوں گاؤں کے لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے۔ خالد نے کہا......

"ٹھیک ہے تم یہیں رکو میں جاکر دونوں گاؤں میں لوگوں کو بتا دیتا ہوں"۔

زیبا نے جواب دیا...... "تم اکیلے مت جاؤ، میں بھی چلتی ہوں"۔
خالد نے سوچا کہ اس ماحول میں رات کے سناٹے میں زیبا کا جانا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ اس نے نرمی سے کہا......

"دیکھو تمہارا جانا مناسب نہیں ہے۔ پھر یہ کہ چودھری صاحب کی آنکھ کھلے گی تو بہت پریشان ہو جائیں گے"۔

خالد کی بات سے زیبا اور برہم ہو گئی۔ اس نے جوشیلے انداز میں دھیرے دھیرے کہا۔ کیوں کہ اسے ڈر تھا کہ بحث و تکرار سے کہیں ابا کی نیند نہ کھل جائے، پھر تو مشکل پیدا ہو سکتی ہے۔

"خالد تم نے پٹنہ سے آتے ہوئے بھی یہی بات کہی تھی۔ مگر اس وقت میں چلوں گی اور تم مجھے بالکل نہیں روک سکتے۔"

خالد نے سمجھ لیا کہ زیبا اس وقت بالکل نہیں مانے گی۔ اس لیے دونوں ڈرے سہمے ایک بڑے فرض کی ادائیگی کو چلے ۔ یہ انسانی فرض تھا۔ چونکہ اس علاقے سے وہ بہت واقف نہیں تھے اس لیے چلتے ہوئے راستے میں دونوں نے مشورہ کیا کہ بہتر ہوگا کہ بکھری سے رضوان کے دوست سہیل کو ساتھ لے لیا جائے۔ وہ اس علاقے سے خوب اچھی طرح واقف ہے۔ دونوں نے ایک روز پہلے ہی گنیش پور آتے ہوئے راستے میں

سہیل کا گھر دیکھ لیا تھا۔ دونوں خاموشی سے سہیل کے گھر کے پاس آئے۔ وہاں کئی جلے ہوئے گھر تھے۔ آنگن میں ایک چٹائی پر سہیل پڑا سو رہا تھا۔ آہٹ ملتے ہی وہ چوکنا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اسے لگا کہ گھر چھین کر اب کوئی اس سے اس کی جان چھین لینے آیا ہو گا۔ چونکہ اس نے اپنی بیوی کو میکے بھیج دیا تھا اس لیے وہ ذرا بے پروا بھی تھا۔ خالد نے دور ہی سے کہا:

"سہیل صاحب ہم لوگ ہیں رضوان کے دوست خالد اور زیبا"۔

سہیل نے کہا......

"ہاں ہاں کل ہی تو چوک پر آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ مگر اس وقت کیسے؟ کوئی خاص بات؟ مجھے تو شرم بھی آتی ہے کہ میرے آنگن میں اس ایک ادھ جلی چٹائی کے علاوہ کچھ بھی نہیں، کہاں بٹھاؤں آپ لوگوں کو؟"

زیبا نے کہا......

"نہیں سہیل صاحب بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔ چنڈیہا اور پنچھور میں چل کر لوگوں کو آگاہ کرنا ہے۔ رات کے دو بجے دنگائیوں نے حملہ کرنے کا پلان بنایا ہے، ہم دونوں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔"

سہیل ہڑبڑا کر کھڑا ہوا اور ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ تینوں پہلے پنچھور پہنچے۔ یہاں تو لگتا تھا کہ نہ آدم ہے نہ آدم زاد۔ ایک ہُو کا عالم۔ ادھر ادھر جھانکتے ہوئے تینوں گاؤں میں گشت کر رہے تھے۔ سناٹے کا ماحول اور چھ قدموں کی خاموش آہٹ جیسے سطحِ آب پر موجِ صبا سے بنا گرداب کا

نقش۔ ایک طرف ایک چائے خانے کی ٹاٹ سے روشنی چھن کر آرہی تھی۔ سہیل روشنی دیکھ کر رک گیا۔

"آیئے یہاں جلیل چچا کا گھر ہے، شاید وہ جاگ رہے ہوں"۔ تینوں وہاں پہنچ گئے۔ سہیل نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک سہمی اور گھٹی ہوئی آواز آئی ......"کون ؟"

سہیل: ہم ہیں جلیل چا سہیل، بکھری سے آرہے ہیں ذرا دروازہ کھولیے۔

جلیل چچا: (کراہتے ہوئے) آتا ہوں بیٹے، مگر اس رات میں"

بوڑھے جلیل کی نظر جب خالد اور زیبا پر پڑی تو ذرا سہم سے گئے۔ وقت کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے سہیل نے تعارف کرایا۔

سہیل: جلیل چا یہ خالد اور زیبا ہیں۔ یہ لوگ پٹنہ سے ریلیف کا کام کرنے آئے ہیں۔ ابھی یہ لوگ گنیش پور سے ہمارے پاس آئے ہیں کہ پنچھورا اور چنڈیہا کے لوگوں کو آگاہ کرنا ضروری ہے۔

جلیل چچا: کیوں بیٹا کچھ ہوا ہے کا؟

سہیل: ان لوگوں نے کسی سے سنا ہے کہ رات کے دو بجے آج ہی ان دونوں گاؤں پر حملہ ہونے والا ہے۔

زیبا: ہاں انکل ہم دونوں نے گنے کے کھیت میں کسی کو بات کرتے سنا ہے۔ آپ لوگ ہوشیار ہو جایئے۔

جلیل چچا: کا ہوسیار ہو جائیں بیٹی جہان جائیں گے وہاں تو یہی سب ہوگا۔ اب سب کچھ اوپر والے پر چھوڑ دیا ہے۔ اس بوڑھی ہڈی میں اتنی سکت بھی نہیں ہے......

سہیل : اچھا جلیل چاہم لوگ چنڈیہا جارہے ہیں یہاں دوسرے لوگوں کو بھی آگاہ کرادیجیے۔ اسلم بھائی کو جگادیجیے۔ آپ کیوں پریشان ہوں گے۔ چاچی اور بہو تو نہیں ہوں گی!۔

جلیل چچا: اچھا بیٹا ہم اسلم کو جگا دیتے ہیں۔ اسلم تو اپنی ماں اور بیوی دونوں کو کل ہی دوسرے گاؤں پہنچا آیا تھا۔

تینوں پنچھور گاؤں سے اب چنڈیہا آگئے ۔ سہیل نے ایک دروازے پر دستک دی۔ کئی دستکوں کے بعد ایک نحیف سی ڈری ہوئی آواز اُبھری...... "ک...... ک...... کون؟"

سہیل : ارے بھولا ماما ہم ہیں، سہیل، بکھری سے آرہے ہیں۔

بھولا : کارے سہیل ای ٹائم تورے مٹر گستی کرے کا ہے، آں؟

سہیل : ماما پہلے باہر تو آیئے۔

بھولا نے ڈرتے ہوئے دروازہ کھولا۔ خالد اور زیبا کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ سہیل نے یہاں بھی شبہ زائل کرنے کی غرض سے صفائی پیش کی......

سہیل : بھولا ماما! یہ خالد اور زیبا ہیں۔ یہ لوگ دوروز سے راحت کا کام اس علاقے میں کررہے ہیں۔ ان دونوں نے گنے کے کھیت میں کسی سے بات کرتے ہوئے سنا ہے کہ دو بجے رات میں پنچھور اور چنڈیہا پر حملہ ہوگا۔

خالد: ہاں انکل ہم دونوں نے گنیش پور میں گنے کے کھیت میں یہ بات سنی ہے۔ اسی لیے آگاہ کرنے آگئے ہیں۔

بھولا: یہ تو بڑی بری کھبر لایا رے۔ اللہ جانے سالا ای دیس
میں کب چین ملے گا؟
اچھا تم لوگ جاؤ ہم سب کو جگا جگا کر بتا دیتے ہیں۔
تینوں وہاں سے شوگر مل چوک کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھے۔ چوک تک پہنچنے سے پہلے ہی دو بج چکے تھے۔ اسی درمیان کچھ شور سا سنائی دیا۔ یہ چیخ و پکار پنچھور سے آرہی تھی۔ سہیل، خالد اور زیبا کے قدم جیسے اچانک رک سے گئے۔ تینوں ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔ انھیں محسوس ہوا کہ ان کی محنت رایگاں ہو گئی۔ زیبا نے محسوس کیا جیسے اس دنگے کے پیچھے ان تینوں کا ہی ہاتھ ہے۔ اگر دونوں گاؤں کے لوگ گاؤں سے بھاگ گئے ہوتے تو یہ تباہی نہ مچتی۔ تینوں سیکڑوں من کے قدم اٹھاتے ہوئے شوگر مل تک آگئے۔ دنگائیوں کا دستہ اب پنچھور سے چنڈیہا پہنچ چکا تھا۔ گھروں میں آگ لگائی جا رہی تھی۔ بچوں کے رونے بلکنے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ عورتوں اور مردوں کی ملی جلی کراہیں فضاؤں میں تحلیل ہو رہی تھیں۔ جیسے یہ فضائیں کراہوں اور آہوں کی بھوکی ہوں، اور یہ سارا انتظام ان ہی کی بھوک مٹانے کے لیے کیا گیا ہو۔ یہ تینوں شوگر مل کے اندر گھس گئے۔ لوہے کا دروازہ بند تھا مگر اس کی تین چار سلاخیں مڑی اور ٹوٹی ہوئی تھیں۔ سہیل نے سلاخوں کو موڑ کر راستہ بنا دیا۔ گویا یہ بھی ایک راستہ ہے مقفل دروازے سے دخول کا! اور یہ راستہ ہم جہاں بھی جائیں موجود ہوتا ہے۔ یہاں رک جانا ہی مناسب تھا۔ ہو سکتا تھا کہ دنگائیوں کا دستہ ادھر سے ادھر ہی آدھمکتا اور مفت میں ان تینوں کو لقمہ اجل بنا دیتا۔ تینوں ایک دیوار سے لگے سرگوشی کر ہی رہے تھے کہ آخر وہ دستہ شور و ہنگامہ برپا کرتا، آگ لگاتا اس چوک تک پہنچ گیا۔ گننے سے

لدی ہوئی ہزاروں بیل گاڑیاں اور وہاں بندھے ہوئے بیل، افراتفری کا ماحول، دنگائیوں میں سب کچھ نہ کچھ بول رہے تھے۔ گنّے اٹھا اٹھا کر کھیلتے اور کھاتے جاتے تھے۔ ایک بار "جے شری رام" کا فلک شگاف نعرہ بھی بلند ہوا جس سے بہت دیر تک فضا گونجتی رہی۔

تاریخ ساز عمل انجام پاچکا تھا۔ دور کہیں کسی گوشے میں بیٹھے ایک مورّخ نے قلم سنبھالا اور اپنی نامکمل کتاب میں ایک جملے کا اضافہ کیا۔

"And after frequent bloodshed, the golden age came into existence."
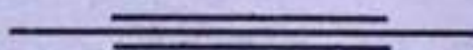
ایک طوفان تھا جو گزر گیا۔ چڑھا ہوا دریا تھا کہ اتر گیا۔ موجوں کے تھپیڑے تھے کہ پر سکون ساحلوں میں سما گئے۔ چیخ و پکار تھی کہ فضا میں تحلیل ہو گئی جیسے سگرٹ کے مرغولے تحلیل ہو جاتے ہیں۔ بچوں اور عورتوں کی کراہیں اور آہیں تھیں کہ دھوئیں کے موٹے بادلوں سے ٹکرا کر زمین پر اوندھے منہ آرہیں۔ کیا کچھ تھا، کیا معلوم؟...... ہاں کچھ تھا کہ اب جیسے کچھ نہ رہا۔ مگر ایک رضوان تھا جو اپنی شدت احساس کی سزا کاٹ رہا تھا۔ یہ تین آدم زاد خالد، زیبا اور سہیل اب شوگر مل سے نکل کر کائنات کی دبیز چادر کے پیچھے کسی گم شدہ کائنات کی جستجو کر رہے تھے۔ مگر بے سود۔ بس بھاری قدموں کو جیسے زمین پر گھسیٹتے ہوئے گنیش پور کی طرف چلے جا رہے تھے۔ ایک چائے کی ٹوٹی ہوئی دکان سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ تینوں کے قدم اچانک رک گئے۔ ہو نہ ہو کچھ دنگائی ابھی اس چائے خانے میں چھپے بیٹھے ہوں۔ تبھی سرگوشی سنائی دی۔

''کیوں راجیس! ابھی یہیں ٹھہرو گے یا چلو گے پرسوتم پور؟''

جواب ملا......

''نہیں یار! اب میں بھور والی ٹرین سے گھر جانا چاہتا

ہوں۔ یہاں تو کھانے پینے کو بھی نہیں ہے۔ میں تو
کہتا ہوں جوگندر تو بھی گھر چلا جا، بلکہ میرے ساتھ ہی
بیر گنیا تک چل کے وہاں سے چندن بارہ چلے جانا۔!"

جوگندر نے جواب دیا......

"لیکن وہاں مسلمان سب ہم کو دیکھ کے جرورے سک
کرے گا۔ اچھا چلو چلتے ہیں۔ دیکھا جائے گا۔ سالا
نیوتا دے کے بلاتا ہے آ کچھ بھی کھانے پینے کا پربندھ
نہیں رکھتا۔ لوٹ مار میں تو گریبوں کے گھر میں کچھ ملتا
بھی نہیں اور آج تو لڑکی کا لالچ بھی کھتم ہو گیا"۔

راجیش نے تجویز پیش کی ......

"چلو اسٹیسن ہی چلتے ہیں۔ایک گھنٹے کے بعد ٹرین
آجائے گی۔ آج تو وہاں ٹکٹ دینے والا بھی کوئی نہیں
ہوگا۔ سالا سب اسٹاف لوگ دو بجے کے ہنگامہ میں
بھاگ گیا تھا۔ حالانکہ سب اپنا ہی لوگ تھا۔"

تینوں یہ گفتگو سن کر چوکنّا ہوگئے۔ خالد اور زیبا نے راجیش اور جوگندر کو پہچان لیا۔ راجیش تو بتیا سے چل کر آیا تھا اور جوگندر رضوان ہی کے گاؤں کا تھا۔ چندن بارہ کے ذکر سے یہ راز ابھی ابھی کھلا۔ سہیل بکھری پہنچ کر رک گیا۔ خالد اور زیبا گنیش پور چلے گئے۔ وہاں پہنچنے پر چودھری کلیم الدین نے دونوں کی سرزنش کی۔......

"تم لوگ بھی رضوان کی طرح پاگل پن کا ثبوت دینا
چاہتے ہو"

زیبا نے انکشاف کیا......

”ڈیڈی! رضوان کا بھی پتہ چل گیا ہے۔
وہ یہیں سیتامڑھی حوالات میں ہے۔ اسی گنیش پور میں
اسے بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ Arrest کرلیا گیا
تھا۔“

وہاں کھڑے ہوئے کچھ لوگوں میں سے ایک شخص بول پڑا......
”ہاں ساب جی بچیا ٹھیکے کہتی ہے۔ کلّے ایہاں جیپ
میں آگ لگا رہے تہ نواجی کے ساتھ ایگو انجان آمدی
(آدمی) پکڑا کے چلا گیا“۔

زیبا: ڈیڈی وہ انجان آدمی رضوان ہی تھا۔ دن میں چل کر اسے
Release کرانے کی سوچیے!

۹

خالد نے یہاں سب کو اس امر سے آگاہ کردیا کہ رضوان کو اس کے دوست راجیش کے بارے میں بتانا مناسب نہیں ہوگا۔ اگر اسے معلوم ہوگیا کہ راجیش دنگائی ہوگیا ہے تو اس کی حساس طبیعت مجروح ہوجائیگی۔

مختلف ریلیف ٹیمیں اپنے اپنے طور پر کام کررہی تھیں۔ ماڈرن گارمنٹس فیکٹری کی طرف سے جو اسباب آئے تھے وہ سب تقسیم ہوچکے تھے۔ اس لیے اب لوٹنا ہی تھا۔ چودھری کلیم الدین سب کے ساتھ سیتامڑھی حوالات رضوان سے ملنے گئے۔ رضوان جب سب کے سامنے آیا تو اس کے چہرے سے افسردگی سے زیادہ اپنے ناکام ہونے کا احساس ظاہر تھا۔ زیبا اس کی ڈھارس بندھانے قریب پہنچی۔ کچھ دیر سکوت رہا پھر رضوان ہی نے سکوت توڑا۔

رضوان : معاف کیجیے، میری نادانی سے آپ لوگوں کو پریشان ہونا پڑا۔ میں ...... میں بہت شرمندہ ہوں"۔ آواز بہت پست تھی۔

زیبا: نہیں رضوان! تم بے قصور ہو۔ ہمیں سب معلوم ہے۔ تم تو دنگائیوں سے گاؤں کی حفاظت کرنا چاہتے تھے ۔

گنیش پور میں آگ لگی جیپ بجھاتے وقت پولس نے
تمہیں پکڑ لیا۔

چودھری کلیم الدین: مگر رضوان! تم نروس مت ہونا، ہم ابھی تمہیں یہاں
سے ساتھ لے کر چلیں گے۔

اس کے بعد چودھری صاحب نے انسپکٹر سے بات کی۔ انھیں یقین تھا کہ ان کی سفارش ہی یہاں کافی ہو گی۔انھوں نے انسپکٹر سے کہا......

دیکھیے انسپکٹر صاحب! یہ رضوان بہت اچھا لڑکا ہے۔ یہ
تو ہم لوگوں کے ساتھ ریلیف ٹیم میں آیا تھا۔ اسے
چھوڑ دیجیے۔

انسپکٹر: دیکھیے جناب آپ جو بھی ہوں، آپ اس کی سفارش
کر کے اسے چھڑا نہیں سکتے۔ یہ دنگائیوں کے ساتھ
پکڑا گیا ہے، آپ جا سکتے ہیں۔

چودھری کلیم الدین کو انسپکٹر کی اس روکھی گفتگو سے دکھ ہوا۔ انھوں نے کہا......

"دیکھیے انسپکٹر صاحب آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اسے
لے کر جانا ہماری ذمہ داری ہے۔"

انسپکٹر: تو کیا......؟ مجھے کیا مطلب آپ کی ذمہ داری سے ؟

چودھری کلیم الدین: دیکھیے پربھوناتھ جھا جی مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔

انسپکٹر: یہ دھونس کسی اور کو دیجیے گا۔

چودھری کلیم الدین: تو آپ رضوان کو نہیں چھوڑیں گے ؟

انسپکٹر: نہیں، بالکل نہیں!

چودھری کلیم الدین: لیکن میں اسے لے کر واپس جاؤں گا۔
میں ابھی پٹنہ جھا جی کو فون کرتا ہوں......

انسپکٹر: جائیے جائیے، بہت دیکھے ہیں آپ جیسے ۔ جھاجی یہیں سرکٹ ہاؤس میں ہیں، کہہ کر چھڑا لیجیے!

چودھری کلیم الدین: یہ تو اچھا ہوا کہ آپ نے بتادیا۔ کیا یہاں سے فون کرسکتا ہوں؟

انسپکٹر: یہ سرکاری استعمال کا ہے۔ نجی کام کے لیے آپ کو باہر جانے کا کشٹ کرنا پڑے گا۔

چودھری کلیم الدین زیبا اور خالد باہر آگئے۔ پاس ہی ایک STD بوتھ نظر آیا۔ چودھری کلیم الدین کے تعلقات کھدّردھاریوں سے بہت اچھے تھے۔ اسی لیے وہ جوش میں پولس چوکی سے باہر نکل کر فون کرنے آگئے۔ پربھوناتھ جھا سرکٹ ہاؤس میں موجود تھے۔ فون پر بات کرنے سے پہلے انھوں نے سوچا کہ بوتھ پر دوسرے لوگ ان کے درمیان کی باتوں کو سن نہ لیں، اس لیے انھوں نے شیشے کے بنے باکس میں جاکر بات کرنا مناسب سمجھا۔ چودھری کلیم الدین کو معلوم تھا کہ جھاجی کا ایس پی کو ایک فون کردینا کافی ہوگا۔ اگر رضوان کا چالان کٹ گیا تو مشکل بڑھ جائے گی۔ ایس پی تو جھاجی کا اپنا آدمی تھا بلکہ موجودہ ایس پی کا تبادلہ بھی جھاجی نے اس کی خواہش کے مطابق بغیر کسی رشوت کے کرایا تھا۔ اس میں شاید جھاجی کا بھی کچھ مفاد تھا۔ ایسا تو اس ملک میں اکثر ہوتا ہے۔

فون پر آداب پرنام کے بعد پربھوناتھ جھا نے بتایا کہ رضوان تو بہت خطرناک لڑکا ہے۔ اس تھانے کا انسپکٹر بتارہا تھا کہ وہ ہندو مسلم کی فیلنگ بہت رکھتا ہے۔ جھاجی نے وضاحت کی ......

"ہم کہتے ہیں کہ اس بھارت ورش میں تو سب کو مل جل کے رہنا چاہیے نا!...... ہندو لوگ بھی جو دنگا کرتے

کراتے ہیں ای کو نو سر ایسے کام تھوڑی ہی نا ہے......"

چودھری کلیم الدین نے مقصد بیان کیا......

"مگر آپ یہ کام کرا دیجیے اگلی بار ہماری خواہش ہوگی کہ آپ ہی چیف منسٹر بنئے۔ میں تو کہتا ہوں کہ آپ سے ادھک یوگیہ بہار میں کوئی دوسرا ہے بھی نہیں۔ الیکشن میں ہم ہر طرح سے آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں......"

پربھوناتھ جھا: ٹھیک ہے چودھری صاحب آپ تھانہ میں جائیے ہم ایس پی کو بول دیتے ہیں، ایس پی تھانہ کو بول دے گا آپ کا کام ہو جائے گا......
مگر چودھری صاحب! چناؤ کے سمے آپ پر جو چندہ ہوگا دینا پڑے گا"۔

چودھری کلیم الدین نے حامی بھری......

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے جھا جی میں پیچھے کب ہٹا ہوں......"

چودھری کلیم الدین باہر نکلے تو زیبا نے بیتابی سے پوچھا......

"کیا ہوا ڈیڈ"؟

چودھری کلیم الدین نے فخریہ انداز میں ......

"کچھ نہیں بیٹی، رضوان ہمارے ساتھ چلے گا۔"

تینوں پولس چوکی پہنچے تو رضوان حوالات سے باہر کرسی پر بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ رضوان ان کے ساتھ ہولیا۔ چودھری کلیم الدین نے فاتحانہ انداز میں انسپکٹر کی طرف دیکھا تو وہ اپنی شکست خوردگی پر پردہ ڈالنے کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ رضوان جب پولس چوکی سے باہر نکل رہا تھا تو نوازی کی بے بس نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ مگر اس بیچارے کا

تعلق کھدر دھاریوں سے نہیں تھا، یہ الگ بات تھی کہ اس نے چناؤ کے زمانے میں ان کی خوب خوب مدد کی تھی، مگر ایسی مدد کرنے والوں کے چہرے امتداد زمانہ کی گرد میں روپوش ہو جاتے ہیں۔

رضوان حوالات سے نکل کر پٹنہ آ گیا۔ واپسی میں رضوان راستے ہی میں اتر گیا۔ اس کی رہائش گاہ قریب تھی۔ بہت اصرار کرنے پر بھی وہ چودھری کلیم الدین اور زیبا سے معذرت خواہی کے بعد مضمحل سا اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اسے آج اپنے خاندان والوں کی یاد آ رہی تھی۔ اسے غصہ بھی آ رہا تھا کہ دو روز وہ سیتامڑھی حوالات میں رہ گیا تھا، مگر اس سے ملنے گھر سے کوئی نہیں آیا تھا۔ حالانکہ روزنامہ "قومی تنظیم" میں گرفتار ہونے والوں کے نام بھی شائع ہوئے تھے۔ اس طرح دیکھا جائے تو اس وقت اس کی نظر میں چودھری کلیم الدین اور زیبا سب سے زیادہ محترم ہو گئے تھے۔

اپنے کمرے پر پہنچ کر رضوان نے نماز ظہر ادا کی اور سو گیا۔ سیتامڑھی حوالات میں مچھروں نے اس کے جسم سے کئی یونٹ خون چوس لیا تھا۔ شاید مچھروں کی بھوک مٹانے کے لیے ہی حوالات کی تشکیل ہوئی ہے۔ سیتامڑھی سے آتے ہوئے سب کے ساتھ رضوان نے لائن ہوٹل میں اپنی پسند کی کھیر کھائی تھی، اب اس وقت اس کا دماغ کچھ آرام چاہتا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو شام کے چار بج رہے تھے۔ اس نے بغل میں پڑی اپنی ڈائری اٹھالی۔ اس ڈائری میں رضوان اپنی پسند کے اشعار اور اقوال زرّیں نوٹ کیا کرتا تھا۔ ڈائری کے صفحات الٹتے ہوئے اس کی نظر اس شعر پر ٹھہر گئی ؎

گزر جا بن کے سیل تندرو کوہ وبیاباں سے

گلستاں راہ میں آئے تو سیل نغمہ خواں ہو جا

رضوان کے ذہن پر ایک بار پھر خیالات کے بادل چھانے لگے۔

دوسرا صفحہ الٹتے ہی مولانا روم کا یہ شعر سامنے آیا ؎

صبر تلخ آمد ولیکن عاقبت

میوۂ شیریں دہد پر منفعت

یعنی صبر کڑوا ہوتا ہے لیکن بالآخر میٹھا اور مفید پھل دیتا ہے۔
اپنے اپنے وقت کے دو بڑے مفکروں کے نظریہ ہائے حیات پر رضوان سوچنے لگا۔ مولانا روم تو علامہ اقبال کے استاد معنوی اور پیر رہے ہیں۔ تو کیا صبر کر لینا چاہیے اور کیا صبر کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے تماشائی محض بنے رہیں......!

رضوا ن اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ رضوان "Yes come in" کہتا ہوا دروازے پر آگیا۔ سامنے اس کے احباب اور اعزا کھڑے تھے۔ نسیم الحق، عظیم، ولی الرحمٰن، تاج الدین، ثاقب، پرویز شاہد، ابو بکر رضوی اور امتیاز سالک۔ سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ رضوان حوالات سے رہا ہو چکا ہے۔ ثاقب چوں کہ کھدر دھاریوں سے ذرا قریب تھا، اس لیے اسے معلوم ہو چکا تھا۔ پر بھوناتھ جھا کا پی اے اس کا خاص دوست تھا۔ دن میں اس نے سیتامڑھی سرکٹ ہاؤس فون کیا تھا تو معلوم ہو گیا تھا کہ جھاجی کی سفارش پر رضوان رہا ہو گیا ہے۔ سبھوں نے طرح طرح سے ڈھارس بندھانے کی کوشش کی۔ کچھ نے رضوان کو کھوکھلی سیاست اور بہت زیادہ قوم پرستی کے برے نتائج سے آگاہ بھی کیا۔ رضوان نے اقبال کا شعر سنایا ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش

میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
پھر وضاحت کی ...... ''دوست مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ لیکن تم
لوگ سوچو تو سہی کہ آخر کون کرے گا اس
طوفان کا مقابلہ۔ یہ جو روز روز فسادات
ہو رہے ہیں کون لڑے گا ان کے خلاف؟ کیا
سب کچھ حالات پر چھوڑ دینا چاہیے؟

ثاقب نے ڈرتے ڈرتے لقمہ دیا......

''دیکھیے رضوان بھائی! آپ سب کام جذبات میں کرنا
چاہتے ہیں۔ کیا آپ ''اکیلے''اس فساد اور اس کرپشن کو
ختم کر دیں گے؟''

رضوان کو یہ ''اکیلے' والا نظریہ سننا بالکل پسند نہیں تھا۔اسے قدرے غصہ بھی آیا۔ آخر سو آدمی یا ہزار آدمی کب جمع ہوں گے اور کیسے جمع ہوں گے۔ رضوان نے جوش میں ابلتے ہوئے کہا۔

''اگر تم جیسے دس بیس ہجڑے نوجوان ہوں تو کیا ہو سکتا
ہے۔ تم سب کے سب سالے نہ دیش کے، نہ قوم کے،
نہ مذہب کے، نہ سماج کے، میں تو کہتا ہوں کہ تم سب
اپنے آپ پر ہی بوجھ ہو۔ تم سب کے سب بزدل، خود
غرض اور موقع پرست ہو...... مجھے میرے حال پر
چھوڑ دو، مجھے نہیں چاہیے تمہاری یہ سڑی گلی ہمدردی!''

سبھوں نے سمجھ لیا کہ رضوان کا موڈ خراب ہے۔ سب وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ البتہ نسیم الحق اور پرویز رہ گئے۔ رضوان کا چہرہ اب بھی تمتما رہا تھا۔ وہ کمرے میں بے چین سا ٹہل رہا تھا۔ کمرے میں کونے پر رکھی

بالٹی سے پانی لے کر رضوان نے اپنے چہرے پر کئی بار چھینٹے مارے۔ کچھ راحت ملی تو اسٹو جلا کر چائے بنانے لگا۔ نسیم الحق اور پرویز نے منع کر دیا کہ باہر چل کر پیر بہور کے پاس ارجن کی چائے پی جائے گی۔

تینوں سڑک پر نکل آئے۔ رضوان کو اپنی سخت کلامی پر خفت بھی ہوئی مگر کچھ دیر پیچ وتاب کھانے کے بعد مطمئن ہو گیا۔ آج اسے بعد مغرب پروفیسر صابر علی سے ملنا بھی تھا۔

۱۰
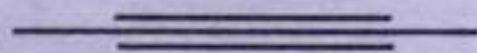
نماز مغرب کے بعد پروفیسر صابر علی اپنے خاص انداز میں مسند لگائے بیٹھے تھے۔ دو حضرات اور تشریف رکھتے تھے۔ حسب معمول پروفیسر صاحب کی تقریر جاری تھی۔ رضوان جوں ہی کمرے میں داخل ہوا، پروفیسر صابر علی کی تقریر میں قدرے وقفہ ہوا۔ پھر جاری ہوگئی۔

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس دنیا میں جو تصادم اور جنگ ہے، اس کی بنیاد کیا ہے؟ اگر ہم بنیاد تلاش کر لیتے ہیں تو یقیناً اس کا حل بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ ایسے ہمارا جو طریقہ ہونا چاہیے وہ حکم رسول کے مطابق ہونا چاہیے۔ رسول اکرم نے فرمایا ہے...... "میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں، جو مجھ پر ظلم کرے میں اسے معاف کر دوں"۔

وہاں بیٹھے دوسرے دونوں حضرات اثبات میں سر ہلاتے رہے اور "بیشک بیشک" کا آموختہ سناتے رہے۔ رضوان البتہ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ یوں تو اس پر خاموشی غالب تھی مگر اندر بے چینی کی کیفیت تھی۔ صابر

علی نے رضوان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا......

"کہو بیٹے، کیسے ہو؟ قومی تنظیم میں تمہاری گرفتاری کی خبر پڑھی تھی۔ افسوس بھی ہوا۔ میں نے کبھی تمہیں سمجھایا بھی تھا کہ اس دنیا میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں وہ تو ارتقائے کائنات کا حصہ ہیں۔ تبدیلیاں کسی نوع کی بھی ہو سکتی ہیں۔ آج جو کچھ بھی ہو رہا ہے اسے ہونا ہے"۔

رضوان کو ان کی اس گفتگو سے اندر اندر اختلاف بھی ہوا، مگر وہ مؤدب بیٹھا رہا۔ وہاں بیٹھے دوسرے دو حضرات میں سے ایک نے کہا......

"سب سے پہلے تو ہمیں اپنے آپ کو ٹھیک کرنا ہوگا۔ ردعمل میں کوئی کام کرنا اس ملک میں اور بھی خطرناک ہوگا"۔

اس تاثر سے رضوان میں کلبلاہٹ پیدا ہوئی۔ اسے لگا کہ وہ ابھی اس آدمی کا اٹھ کر گلا دبا دے۔ اس سے رہا نہیں گیا۔ وہ ابل پڑا کیوں کہ اس نامعلوم شخص کی بات اسے ایک بھدی گالی معلوم ہوئی۔ پروفیسر صابر علی سے مرعوب ہونے اور ان کا احترام کرنے کے باوجود وہ جوش میں بولنے لگا۔

"معاف کیجیے میں آپ کے اس نظریے سے اتفاق نہیں کرتا۔ اگر کوئی آپ کی بہو بیٹی کو چھیڑے تو آپ اس کا مقابلہ اس لیے مت کیجیے کہ آپ نماز نہیں پڑھتے، روزہ نہیں رکھتے، زکوٰۃ نہیں دیتے۔ اپنے آپ کو ٹھیک کرنا آخر کیا مطلب رکھتا ہے؟ پورا نظام سڑ چکا ہے اور آپ

یہاں بیٹھے تقریر فرما رہے ہیں۔ مسلم عورتوں کی عزت لوٹی جا رہی ہے۔ معصوم بچوں کو نیزے پر اچھالا جا رہا ہے......اور سنیں گے آپ؟...... سورت میں عورتوں کو ننگا کر کے مارچ کرایا جا رہا ہے، ان پر بلیو فلمیں بنائی جا رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی شرم گاہوں کو برچھیوں سے لہولہان کر کے رقص و سرود کی محفلیں سجائی جا رہی ہیں۔ ابھی سیتا مڑھی کے فساد میں امام مسجد کو مار کر ان کے دونوں کان کاٹ لیے گئے............ آپ اپنی چوکھٹ سے کبھی باہر جھانک کر دیکھیے ...... آپ ...... آپ کہتے ہیں کہ رد عمل میں کوئی اقدام خطرناک ہو سکتا ہے۔ کیا یہ نقشہ، یہ منظر آپ کو خطرناک نہیں معلوم ہوتا۔ تف ہے ایسی سوچ پر ...... میں تو کہتا ہوں کہ ہم سب اپنی ذات کے خول میں بند ہیں اور باہر نہیں نکلتے کہ باہر خطرہ ہے۔ ہونے دو جو بھی ہوتا ہے ...... اور اپنے سڑے ہوئے نظریہ کے دفاع میں حدیث پاک کا کوئی ٹکڑا پیش کر دیتے ہیں............ پھر تو آرام ہی آرام ہے......"

رضوان کی اس جذباتی تقریر کو دونوں حضرات ہونق کی طرح سنتے رہے۔ صابر علی درمیان میں کہیں خلل انداز نہیں ہوئے۔ شاید وہ سمجھ چکے تھے کہ اس وقت اس سیل تند کے سامنے ان کی فہمائش محض خس و خاشاک ثابت ہو گی۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر رضوان کے قریب آئے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے ......

”بیٹے بہت پریشان مت ہو، انشاء اللہ تمہاری سوچ کا کوئی نتیجہ ضرور نکلے گا۔ تم جیسے اور بھی نوجوان ہوں گے مگر ہمیں ذرا ہوش مندی اور حکمت عملی سے کام لینا ہوگا۔ آخر مسلمان اس ملک میں کتنے ہیں! پھر یہ کہ ان کی اقتصادی حالت بھی بہتر نہیں، اس کے علاوہ ان کے دوسرے مسائل بھی ہیں۔ اس لیے ہمیں ہر حال میں سوجھ بوجھ سے کام لینا چاہیے۔ کبھی کبھی جہاد باللسان کا درجہ جہاد بالسیف سے بڑھ جاتا ہے۔ شاید جہاد بالسیف کی پوزیشن میں ابھی ہم بالکل نہیں۔ اللہ نے قرآن میں کئی مقام پر فساد پیدا کرنے سے منع فرمایا ہے۔اگر دوسرے لوگ نہیں سمجھتے تو کم سے کم اہل ایمان کو تو سمجھنا ہی چاہیے۔ پوری دنیا اپنی تمام ترجزیات کے ساتھ بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوگی۔ قرآن میں اللہ نے فرمایا ہے:
زمین میں چلنے والا کوئی جاندار اور ہوا میں اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں ہے جو تمہاری طرح ایک امت نہ ہو اور ہم نے اپنے دفتر میں کسی کے اندارج میں کوتاہی نہیں کی ہے۔ پھر وہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جائیں گے۔ تو کیا آج جو لوگ زمین پر فساد پیدا کرتے ہیں اور انسانوں کا خون بہاتے ہیں وہ اس کے لیے جواب دہ نہ ہوں گے ...... لیکن رضوان تم تو دانا اور پڑھے لکھے ہو، تمہیں مولانا روم کی مثنوی کا وہ مشہور شعر تو یاد ہوگا

تو برائے وصل کردن آمدی

ئے برائے فصل کردن آمدی

رضوان ، تم اپنے آپ کو سنبھالو، سب ٹھیک ہو جائے
گا۔ تم پرویز کے دوست ہو یعنی میرے بیٹے کی طرح
ہو............ میری ایک بات مانواور کچھ دنوں کے لیے
اپنے گھر چلے جاؤ، تمہارے حق میں اچھا ہوگا......"

رضوان نے بڑے غور سے پروفیسر صابر علی کی باتیں سنیں۔ یہ الگ بات تھی کہ رضوان کے ذہن پر جو بات نقش تھی وہ اب بھی تھی۔ البتہ گھر جانے والی بات پر ذرا سوچنے لگا۔ وہاں سے اٹھ کر سلام کرتا ہوا باہر آگیا۔ پٹنہ کالج کے پاس رمنہ روڈ پر شالیمار ہوٹل میں کھانا کھاتا ہوا اپنے کمرے پر پہنچا۔ اس نے سونے سے پہلے گھر جانے کے بارے میں سوچا۔ اس نے ابھی ابھی زیبا کی گارمنٹس فیکٹری جوائن کی تھی۔ کیا ابھی چھٹی مل سکتی تھی ۔ اس نے سوچا گھر تو وہ ضرور جائے گا مگر کم سے کم فیکٹری میں کچھ دنوں کام تو کرلے۔ اس نے طے کیا کہ دس روز کے بعد وہ گھر ضرور چلا جائے گا۔

۱۱
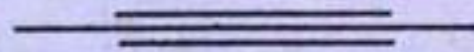
بہت دنوں کے بعد آج رضوان نے فجر کی اذاں سنی۔ ٹھنڈک ہونے کے باوجود آج اس میں اسکت نہیں تھی۔ اٹھ کر بستر ہی پر بیٹھے بیٹھے بدن کو ادھر ادھر موڑ کر چستی بحال کی۔ بڈ سوئچ آن کیا۔ بلب روشن ہوتے ہی پورا کمرہ روشن ہوگیا۔ اس کی نظر روم میٹ کی طرف گئی۔ وہ شاید کسی وقت تخت سے نیچے گر گیا تھا اور اب بھی اسی طرح لحاف میں لپٹا سو رہا تھا جیسے اسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ مختار جس قدر کاہل واقع ہوا تھا، اس سے رضوان کو اندازہ ہوا کہ وہ جان بوجھ کر ہی نیچے پڑا رہ گیا ہوگا کہ اب اٹھ کر تخت پر کون جائے، صبح ایک بار اٹھ کر کاروبار ہستی میں مصروف ہو جائے گا۔ امتحان کے زمانے میں وہ قبلہ رو اکڑوں بیٹھ کر کچھ گھسے پٹے سوال جواب رٹ لیا کرتا تھا۔ کبھی اس بیچارے نے اردو کا کوئی رسالہ نہیں خریدا۔ اردو کے دوسرے طالب علم بھی تقریباً ایسے ہی تھے۔ بس جس طرح اس کائنات کا نظام چل رہا ہے مختار کا نظام زندگی بھی جاری وساری تھا۔ مختار کی لاپروا اور بے فکر طبیعت اور مضحکہ خیز کردار سے رضوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

رضوان باوضو ہو کر مسجد چلا گیا۔ بیگم لاج میں تقریباً تیس لڑکے

رہتے تھے جن میں سے چار پانچ نمازی تھے۔ قاری حفظ الرحمان نے اچھے لحن میں قرأت کی۔ ایک بار فجر کی نماز میں جب قاری صاحب قرأت کر رہے تھے تو زلزلہ ہوا تھا۔ وہ ہلنے لگے تھے۔ پیچھے صرف تین مقتدی تھے۔ جب شور ہوا کہ "دھرتی ڈولی" تو سب امام صاحب کو تنہا چھوڑ کر بھاگ آئے تھے۔ امام صاحب کو بھی شک ہو گیا تھا کہ زمین ہل رہی ہے۔ انھوں نے جب پیچھے مڑ کے دیکھا تو ...... مقتدی ندارد۔ وہ بیگم لاج کی طرف بھاگے بھاگے آئے تھے جب تک زمین تھم چکی تھی۔ لوگوں میں اب بھی ہلچل سی تھی۔

بیگم لاج والے ڈاکٹر عزیز صاحب سعودیہ سے لوٹ کر آچکے تھے۔ انھوں نے اپنا Pathological Lab کھول لیا تھا۔ وہ خود اور پورا گھرانہ نمازی تھا۔ البتہ بیگم لاج والی گلی میں چور اُچکّے اور اوباش لونڈے اکثر تاش کھیلتے رہتے تھے۔ یہاں کبھی بم پٹک دیا جاتا اور کبھی قتل کی وارداتیں ہوتیں اور وہیں ایک مزار پر جب قوالی ہوتی تو دیکھا جاتا کہ ان ہی اوباشوں میں سے دو کو حال آرہا ہے۔ یہ منظر رضوان نے بھی دیکھا اور اسے مذہب اور عقیدت کا مذاق ہی سمجھا، کیوں کہ ان میں سے بیشتر ناپاک، اوچھے اور بے دین تھے۔ اکثر اس تنگ گلی میں بچے جگہ جگہ پاخانہ کر دیتے۔ کہیں دو نحیف اور لاغر بچے راستے ہی میں زمین پر سو رہتے۔ یہاں عورتیں کم تھیں مگر ذرّیت کا حساب وکتاب نہ تھا۔ اکثر یہ ہنگامہ بھی سنا جاتا کہ فلاں کی بیوی کے پاس رات فلاں سویا تھا یا فلاں عورت نے فلاں کے پاس رات گزاری تھی۔

مسجد سے آکر رضوان نے اپنے دوست راجیش کو خط لکھا۔ اس کے بعد لال چائے بنا کر بسکٹ کے ساتھ چسکیاں لیں۔ آج اس کا ذہن

کچھ ہلکا لگ رہا تھا۔ اس نے زیبا کو درخواست دینے کے لیے بھی سوچ لیا کہ فیکٹری میں درخواست دیتا ہوا گھر چلا جائے گا۔ بہت دنوں کے بعد آج اس نے شیو بنائی۔ کپڑے تہہ کر کے بیگ میں رکھے۔ چونکہ اسے ٹھنڈک بہت لگتی تھی اس لیے اس نے مفلر اوپر ہی رکھ لیا۔ ابھی وہ تیار ہو کر نکلنے ہی والا تھا کہ زیبا پہنچ گئی۔ اس کے لیے زیبا کا لاج میں آنا ایک حیرت ناک تجربہ تھا۔ اس سے پہلے وہ یہاں کبھی نہیں آئی تھی۔ ایک نوجوان خوبصورت لڑکی کا رضوان سے ملنے کے لیے آنا لاج کے دوسرے لڑکوں کے لیے بڑا ہی معنیٰ خیز اور ایک طرح سے سوالیہ نشان تھا۔ زیبا نے پہلے رضوان کا کمرہ دریافت کیا۔ رضوان سب سے باہر کے کمرے میں رہتا تھا۔ آواز سن کر وہ خود باہر آگیا۔ زیبا کو دیکھ کر اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

"ارے تم؟ کیسے کیسے؟ خیریت تو ہے؟ آؤ اندر آؤ میں ابھی، بس ابھی دفتر کے لیے نکلنے ہی والا تھا...... چلو اچھا ہوا کہ تم آگئی ...... میرا مسئلہ حل ہو گیا......!"

زیبا کی آمد پر لاج میں ہلچل سی مچ گئی۔ سارے لڑکوں میں اس کے آنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ کوئی لڑکا کمرے سے کھنکھارتے ہوئے باہر آتا اور رضوان کے کمرے میں جھانک لیتا، کبھی کوئی لڑکا استنجا کے بہانے رضوان کے کمرے کے پاس سے گزرتا، کبھی کوئی لڑکا رضوان کے کمرے میں اخبار کے لیے آجاتا.......... سب کے سب گویا ایک نظر زیبا کو دیکھ لینا چاہتے تھے۔ زیبا نے رضوان سے کہا..........

"دفتر کے لیے اگر تیار ہو تو چلو چلتے ہیں"

رضوان نے قدرے تکلف کے انداز میں کہا......

"ہاں چلتے ہیں۔ مگر پہلے چائے تو پی لیں.......... ایسے

میں کچھ دنوں کے لیے گھر جانا چاہتا ہوں......!"

زیبا نے پہلے رضوان کو منع کیا کہ ابھی تو فیکٹری جوائن کیے ہوئے صرف آٹھ روز ہوئے ہیں، کم سے کم ایک مہینے کام تو کرنا چاہیے۔ مگر شاید زیبا کسی طرح رضوان کو روک لینے پر قادر نہیں تھی۔ رضوان اسٹو جلا کر چائے بنانے لگا۔ بہت جلد لیمن ٹی تیار ہو گئی......

"لو چائے پیو!"

زیبا نے رسمی طور پر کہا......

"ارے اس کی کیا ضرورت تھی ۔ ایسے چائے کا رنگ تو خوب آیا ہے"

"پی کر دیکھو صرف رنگ نہیں اس کا فلیور بھی اچھا ہو گا"۔

رضوان نے جواب دیا۔

"تم نے جب اتنی محبت اور خلوص سے چائے بنائی ہے تو فلیور بھی یقیناً اچھا ہو گا......"

زیبا نے تاثر پیش کیا اور ایک ملا جلا قہقہہ ابھرا۔ چائے لینے کے بعد زیبا نے سوال کیا......

"رضوان گھر سے تمہاری واپسی کب تک ہو گی؟ دیکھو ایک ہفتہ بہت ہوتا ہے، جلدی آجانا ورنہ بڑا نقصان ہو گا"۔

رضوان نے بے کیفی کے انداز میں کہا......

"کیسا نقصان......؟"

"اچھا، تو تمہیں یہ بھی بتانا پڑے گا۔حسّاس صرف دیش اور سماج کے لیے ہو۔ زندگی کے دوسرے Dimensions پر بھی کبھی غور کر لیا کرو۔"

رضوان کو زیبا کے اس جملے کا مطلب کچھ خاص سمجھ میں نہیں آیا۔

البتہ اسے دوسرے Dimensions کا مطلب ایک لمحے کے لیے "محبت" سمجھ میں آیا مگر فوراً ختم ہوگیا کہ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر یہ کہ زیبا اس سلسلے میں ایسی باتیں کیوں کرے گی۔ رضوان نے کہا......

"اچھا پہلے گھر تو جانے دو۔ واپسی کے بعد زندگی کے دوسرے Dimensions پر بھی غور کروں گا"۔

"چلو تمہیں ہارڈنگ پارک بس اسٹاپ چھوڑ دوں"

رضوان نے منع کیا......

"نہیں نہیں میں چلا جاؤں گا۔ ایسے بھی ہارڈنگ پارک نہیں بلکہ گائے گھاٹ پل (گاندھی سیتو) پر جاکر بس لے لوں گا اس طرح ایک گھنٹے کی بچت بھی ہو جائے گی۔"

"تو کیا ہوا، وہیں چلتے ہیں۔ کتنا وقت لگے گا، مشکل سے پانچ سات منٹ۔ آؤ گائے گھاٹ پل کے لیے چلتے ہیں!۔"

رضوان کے لاکھ منع کرنے کے باوجود زیبا رضوان کو چھوڑنے گھائے گھاٹ پل تک آئی۔ رضوان بس پر سوار ہوگیا اور جب بس چل پڑی تو زیبا وہاں سے اپنی فیکٹری کی طرف روانہ ہوگئی۔ گاڑی چلاتے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ گرم آنسو کے چند قطرے اس کے دونوں رخساروں پر ڈھلک آئے ہیں۔ اس نے اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھے اور پھر ٹیپ آن کردیا۔ جگجیت سنگھ کی آواز میں غالب کی غزل گائی جارہی تھی......

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

غزل ختم ہونے سے پہلے ہی وہ فیکٹری پہنچ گئی۔

۱۲

چندن بارہ ایک بڑی آبادی پر مشتمل بستی ہے۔ اس گاؤں میں کم وبیش پندرہ ہزار لوگ بستے ہوں گے۔ یہاں مولانا حسین احمد مدنیؒ اور دوسرے زعمائے قوم تشریف لاتے رہے ہیں۔ مولانا اسعد مدنی آج بھی سال میں ایک بار اس گاؤں کا دورہ ضرور کرتے ہیں ۔یہاں ان کے مریدوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ڈاکٹر سید محمود جب بہار کے وزیر تعلیم تھے تو یہاں آئے تھے اور یہاں کی لائبریری انجمن ریاض العلوم کو ایک بڑی الماری بطور عطیہ فراہم کرائی تھی جو آج تک ان کے نام سے منسوب ہے۔ لائبریری کے علاوہ یہاں چھ مسجدیں، تین مدارس عربیہ اور ایک جدید طرز کی اکادمی قائم ہے۔ پورب میں لال بکیہ ندی ہے جو کبھی بیس گز پورب جاتی ہے اور کبھی بیس گز پچھّم۔ اس ندی میں کئی لوگ ڈوب کر مر بھی چکے ہیں۔ رضوان اس ندی اور یہاں کے پرفضا ماحول کا دلدادہ تھا۔ شام کو ندی کنارے ریت پر بیٹھنا، احباب کے ساتھ منڈلی جمانا اور اپنے دوست ظفر سے گیت اور غزلیں سننا، وقت ہوجانے پر ندی کے پانی سے وضو کر کے وہیں ساحل دریا پر نماز مغرب ادا کرنا...... ایک زمانے تک رضوان کا معمول رہا تھا۔ اس سے بھی پہلے لڑکپن میں جب وہ بھینس چرایا

کرتا تھا تو ندی میں اکثر بھینس دھونے اور نہلانے آنا پڑتا تھا۔ ایک بار وہ خود بھی ڈوبتے ڈوبتے بچا تھا کہ اسے ابھی پوری طرح تیرنا نہیں آیا تھا۔

اس گاؤں کی چند برگزیدہ ہستیوں میں مولانا ظہیر حسن، مولانا مظہر الحق، مولانا شفیع احمد صاحب تھے۔ اس سلسلے کی آخری کڑی ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب آج بھی زندہ ہیں۔ ان بزرگوں نے اس بستی سے مقدمہ بازی اور بری رسموں کو ختم کرنے اور اخلاقی تنزل کو مٹاکر لوگوں میں محبت اور یگانگت پیدا کرنے کی بے حد کوششیں کی تھیں۔ یہ لوگ اپنے عہد میں اونچے کردار کا اعلا نمونہ تھے۔ لوگ ان سے ڈرا کرتے تھے۔ ان بزرگوں کے سامنے لوگ بیڑی سگرٹ پینے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔...... آج رضوان دیکھ رہا تھا کہ نئی نسل میں اس درجہ اخلاقی گراوٹ آگئی ہے کہ بوڑھوں سے، یہاں تک کہ اپنے باپ سے کھینی اور بیڑی مانگتے نہیں شرماتی۔ آج رضوان اپنے محبوب گاؤں میں بہت دنوں کے بعد واپس آیا تھا۔ اس کی بس راستے میں خراب ہو گئی تھی۔ جب وہ سیتامڑھی پہنچا تو ار بجے والی ٹرین جاچکی تھی۔ شام ساڑھے سات بجے اسے ٹرین ملی اور جب بیر گنیا پہنچا تو رات کے نو بج چکے تھے۔ اس نے سوچا کہ بیر گنیا مدرسہ احمدیہ سلفیہ میں رک جائے مگر قدرے پس وپیش کے بعد وہ گھر کی طرف چل پڑا۔ ایک دو لوگ آگے پیچھے تھوڑی دور تک چلے اور پھر اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے۔ کوئی بھی دور تک ساتھ دینے والا نہیں تھا۔ خوف وہراس کا ماحول تو تھا ہی مگر اللہ پر توکّل کر کے رضوان تنہا اس سرد رات میں چل پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ ندی پار کرتے ہوئے بہت ٹھنڈک لگے گی، البتہ پانی کم ہوگا۔ ندی کے پاس آکر اس نے اپنے موزے اور جوتے اتارے، سوٹ کیس کو سر پر رکھا۔ ندی پار کرنے کی دعا بِسمِ اللّٰہِ مَجْرٖہَا وَمُرْسٰہَا اِنَّ

رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ پڑھتا ہواپانی میں اتر آیا۔ تین چوتھائی ندی پار کر لینے کے بعد اس کا پیر اچانک کسی خندق میں چلا گیا اور پانی سینے تک آ گیا۔ شرٹ اور سوئٹر شرابور ہو گئے۔ سرد ہوا کے جھونکے بھی تھے۔ رضوان نے سوچا پتہ نہیں آگے اور بھی گہرائی ہو مگر اب واپس آنا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ سامنے کنارا نظر آ رہا تھا۔ اللہ کا نام لے کر قدم بڑھایا اور پانی سے باہر آ گیا۔ سوٹ کیس سے لنگی نکال کر کپڑے بدل لیے اور پھر تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔ کبھی کبھی اسے شبہ ہوتا تو پیچھے مڑ کر دیکھ بھی لیتا۔ گھر پہنچنے پر اس کی سرزنش بھی ہوئی کہ اس خراب ماحول میں اکیلے آنا پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔ اس کے بھائی نے بڑا سا الاؤ سلگایا جس کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنے جسم کو خوب سینکا۔ جب جسم میں حرارت پیدا ہو گئی تو کچھ دیر حالات حاضرہ پر اپنے بھائی سے تبادلۂ خیال کیا پھر کھانا کھا کر سو گیا۔ رات نے اس کی تکان، اس کی سوچ، اس کے انتشار فکر، اس کی شدت احساس اور سیتامڑھی فساد کے ابھرتے مٹتے نقش پر ایک دبیز چادر ڈال دی جیسے کرۂ زمہریر نے دہکتے ہوئے سورج کو اپنے وجود میں ضم کر لیا ہو۔

۱۳
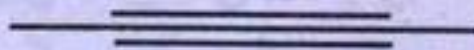
اب حالات کچھ پُرسکون تھے۔ سب لوگ حسب معمول اپنے اپنے کاموں میں جٹ گئے تھے۔ کبھی کبھی وسیم ہوٹل، افتخار ہوٹل، آفتاب ہوٹل اور وصی ہوٹل میں فسادات پر لوگ اظہار خیال کرتے ہوئے دیکھے جاتے۔ جس وقت رضوان چندن بارہ آیا تھا، وہاں کشیدگی کا ماحول تھا۔ اس گاؤں میں غیر مسلم آبادی اقلیت میں تھی۔ کچھ لوگ گھر چھوڑ کر دوسری جگہ جا چکے تھے کچھ باہمت اور اعلا ظرف لوگ اس گاؤں کی سرزمین کو اپنی جائے پیدائش اور اپنے مورث اعلی کی امانت تصور کر کے ابھی ڈٹے ہوئے تھے۔ سیتامڑھی فساد کے بعد کچھ مسلم نوجوانوں نے یہ پلان بنایا تھا کہ اس گاؤں کے سارے ہندوؤں کو ایک ایک کر کے قتل کر دیا جائے۔ ایک بار کچھ نوجوانوں نے میٹنگ بلائی جس میں رضوان کو بھی بلایا گیا۔ ہندوؤں کے خلاف اشتعال انگیزی کی گئی۔ انھیں ستانے اور ان کے گھروں کو آگ لگا دینے کی باتیں کی گئیں تو رضوان نے اس ارادے کی مخالفت کی اور کہا......

"ان بے چاروں کا کیا قصور ہے۔ اگر ان لوگوں نے ہمیں کچھ نقصان پہنچایا ہو تو کوئی بات بھی ہے۔ یہ لوگ تو ہماری آپ کی ماتحتی میں کام کر کے پیٹ پالتے

ہیں.....

ایک نوجوان نے رضوان کے اس موقف کی تردید کی......

"آپ انھیں بے چارہ کہتے ہیں۔ یہی لوگ بیر گنیا اور پھلور یا جیسی ہندو آبادی میں جاجاکر مسلمانوں کے خلاف آگ اگلتے ہیں۔"

رضوان نے بہت ہی نرم لہجے میں اس اختلاف کا سدباب پیش کیا۔

"اگر ان کا ایسا رویہ ہے تو ان کے جو بڑے ہیں، انھیں بلا کر اس غلط اقدام سے باز رکھنے کو کہا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر یہ مانتے نہیں تو پھر دوسرا راستہ اور دوسری حکمت عملی تیار کی جائے گی۔ اس وقت تو ہمیں اپنی حفاظت کے لیے سوچنا ہے۔ خدانخواستہ کسی طرف سے حملہ ہو جاتا ہے تو اس کے دفاع کے اسباب تو ہمارے پاس ہوں۔ ہم پہل نہیں کریں گے مگر اپنی اور اپنی بہو بیٹیوں کی حفاظت کرنے کی سبیل تو پیدا کریں"۔

ہوسکتا تھا کہ اس وقت رضوان بھی مشتعل ہو جاتا مگر عین وقت پر اس کے پردۂ ذہن پر حضور پاک کی ایک حدیث کا یہ مفہوم ابھر آیا۔

"لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق بات کرو"

اس طرح رضوان کی باتوں پر عمل ہوا اور دو چند باشعور ہندوؤں کو بلا کر آگاہ کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے وعدہ کیا کہ اگر ایسا کوئی کرتا ہے تو غلط ہے اور ایسی حرکت پر ہم ان کی پٹائی کریں گے۔ ان کے باپ کی ہمت ہے کہ یہاں کی بات وہاں جا کر کہیں ...... حالانکہ ان نوجوانوں کے باپ یہی

لوگ تھے ......

میٹنگ کا فائدہ یہ ہوا کہ کوئی نامعقول واقعہ یا سانحہ نہ ہو سکا۔ رضوان اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ اگر مسلم نوجوانوں نے کسی طرح کی نازیبا حرکت کی تو ہندو اکثریت گاؤں جیسے اسوگی، بیر گنیا، جیہولی، پچپکی، براہی، کرموا، سراٹھا اور بڈہڑوا کے ہندو بھی خاموش نہ بیٹھیں گے اور پھر یہ علاقہ بھی سیتامڑھی کی طرح فساد کا آتش فشاں بن جائے گا۔ رضوان ''فساد'' کے تصور سے ہی کانپ جاتا تھا۔

۱۴
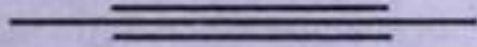
رضوان کو دوروز کے بعد پٹنہ جانا تھا۔اس نے اپنے دوست ظفر کو نیپال کے گئور بازار چلنے کے لیے تیار کیا۔اسے اپنے استعمال کے لیے ٹارچ اور قلم لینا تھا۔ بیر گنیا میں ظفر کی دھاگے بٹن کی دکان تھی جہاں اس کا بھانجہ آصف اقبال بیٹھا کرتا تھا۔ آصف لبّو کے نام سے مشہور تھا۔لبّو جب شیر خوار تھا اسی وقت اس کا باپ کسی مہلک مرض کے سبب اللہ کو پیارا ہوگیا تھا۔پپّو اور لبّو کی ذمہ داری اب ظفر پر تھی۔ پپّو لبّو سے بڑا تھا۔

سائیکل سے ظفر اور رضوان گئور بازار کے لیے چلے ۔راستے میں مہووا گاؤں تھا۔یہاں رحمت اللہ بھائی اور مظہر بھائی بڑے مشہور سماجی خادم اور رہنما تھے ۔اس گاؤں کی ایک بڑی ہستی جناب حفیظ علیگ کی تھی جنہوں نے حصول علم کے بعد علی گڑھ میں لکچر شپ ,چھوڑ کر گاؤں اور علاقے کی خدمت میں زندگی صرف کردی ۔ ایک پرانی سائیکل، بیگ، چھاتا، ٹارچ ان کا کل اثاثہ تھا۔کبھی شیر وانی اور ٹوپی سر سے نہیں اتری۔ بڑے وضع دار قسم کے انسان تھے ...... مگر پورا گاؤں اور علاقہ انھیں پاگل ہی سمجھتا تھا۔یہ بھی المیہ رہا ہے مسلم معاشرے کا کہ لوگ زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کو پاگل ہی جانتے ہیں۔

آفس گھاٹ پر اسی گاؤں کے لوگ رہتے ہیں۔ ندی کے کنارے انگریزوں کے زمانے سے آفس ہے اسی لیے یہ گھاٹ آفس گھاٹ سے مشہور ہے۔ آفس گھاٹ سے پہلے ہی بڑے بند پر ظفر نے سائیکل روک دی۔

وہاں تین چار لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بغل میں "لالونگر" کا بورڈ نظر آیا۔ رضوان نے اس بورڈ اور وہاں بنی دو تین جھونپڑیوں کے بارے میں پوچھا۔ ظفر نے وہاں بیٹھے ہوئے ایک شخص کا رضوان سے تعارف کرایا۔

"رضوان یہ ہیں میرے استاد درگاہی جی!"

درگاہی جی نے رضوان کو سلام کیا۔ ظفر نے بتایا کہ یہ لوگ سیتامڑھی فساد سے متاثر ہیں۔ جس علاقے سے یہ لوگ آئے ہیں وہاں مسلمانوں کا کلچر بھی ہندوؤں جیسا ہے۔ خود استاد کا نام مصری لال ہے اور جوان کے ساتھ آئے ہیں ان کا نام رام آشیش تھا۔ یہاں مظہر بھائی اور رحمت اللہ بھائی اور دوسرے لوگوں نے ان کا نام عبدالرحیم رکھ دیا ہے۔ ظفر نے اس طرح تعارف کرایا کہ رضوان ایک بار پھر سیتامڑھی کی آہوں بھری دنیا میں پہنچ گیا۔ درگاہی جی نے ذرا الگ ہٹ کر اپنا دکھڑا سنایا۔

"کا کہیں جفر بابو رات ہم لوگوں کے ساتھ بڑا گھات ہو گیا ہے"!

ظفر نے پوچھا......

"کیا ہوا......؟"

درگاہی جی نے بڑی لجاجت سے کہا......

"کا کہیں سرم بھی آتی ہے۔ ہم لوگ پھر اپنے گاؤں واپس جا رہے ہیں۔ ایہاں ت مسلمان دیکھ کے ہم لوگ بس گئے تھے۔ مجہر صاحب اور رحمت اللہ صاحب نے

بڑی محنت کر کے ایہاں ہم لوگوں کو بسایا...... مگر کا کہیں
جفر بابو بڑا اتینت ہو گیا......"
ظفر نے بے چینی سے پوچھا......
"آخر ہوا کیا، کچھ بتایئے، ہم لوگوں سے کچھ ہونے والا
ہوگا تو کریں گے ......"
درگا ہی جی نے شرمندگی کے ساتھ کہنا شروع کیا......
"کا کہیں جفر بابو!......رات ہمرے گھر میں دو تین آدمی
گھس کر بٹیا (گونگی بیٹی) کے ساتھ غلط کام کیا ہے
......ہم ت باجا پارٹی میں دس بیس روپیہ کمانے چلے گئے
تھے آج سبیرے آئے ہیں...... سن کے ت تن بدن میں
آگ لگ گیا ہے ...... آپ ہی لوگ کہیے مسلمان گاؤں
میں آکر ہم کو کا پھل ملا؟"
ظفر نے جوش میں کہا......
"درگا ہی جی آپ گھبرایئے نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔
ہم پتہ کرتے ہیں سب معلوم ہو جائے گا اور سالوں کو
سزا بھی ملے گی...... آپ اطمینان رکھیے؟"
مگر درگا ہی جی واپس اپنے گاؤں جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔
انھوں نے بڑے ہی نرم لہجے میں کہا......
"نہیں جفر بابو اب تو ہم لوگ آج ہی سام کے گاڑی
سے چلے جائیں گے۔ آپ سے ملتے جلتے رہیں گے۔ ایسا
گھٹنا وہاں نہیں گھٹا۔ مسلمانوں سے بڑی تکلیف ہوئی
ہے۔ کا ہے کے لیے لوگ نماج پڑھتا ہے......"

درگاہی جی کی باتوں میں دم تھا۔ ظفر سمجھ گیا کہ وہ ماننے والے نہیں ہیں۔یوں بھی دیکھا جائے تو درگاہی جی کے جذبات اور ملّی احساس کو جس طرح چکنا چور کردیا گیا تھا،ان کا جذباتی ہونا فطری تھا اور مسلمانوں کے تیئں اس طرح کی رائے قایم کرنے میں وہ حق بجانب تھے۔ رضوان نے محسوس کیا کہ درگاہی جی کے ساتھ جو بد سلوکی ہوئی ہے اس کا ذمہ دار وہی ہے۔ رضوان مسلمانوں کی اس آبادی میں درگاہی جی کی گونگی بیٹی کے ساتھ بد فعلی کو ایک بد نما داغ تصور کررہا تھا۔ کیا مسلمان اپنے بھائی کے گھر میں محفوظ نہیں رہ سکتا۔پھر ہمہ گیر اخوت کا منشا کیا ہے۔

رضوان اور ظفر دونوں نے درگاہی جی کو سو روپے دیے اور پھر ملتے رہنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوگئے۔ ظفر نے درگاہی جی سے ہارمونیم سیکھنا شروع کردیا تھا مگر اب اسے اپنا بڑا خسارہ نظر آرہا تھا۔اگر درگاہی جی یہاں ہمیشہ کے لیے رہ جاتے تو ظفر موسیقی کے ابتدائی رموز ضرور سیکھ لیتا۔

۱۵
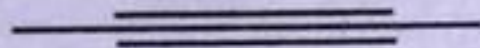
رضوان کو پٹنہ سے آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوچکا تھا۔ چھٹی کی درخواست کے مطابق اب اسے واپس جانا چاہئے تھا۔ پھر یہ کہ نوکری ابھی ابھی جوائن کی تھی اس لیے وقت کی پابندی بھی لازمی تھی۔ کوئی سرکاری دفتر تو نہیں کہ گیارہ بجے گئے اور دوبار کھینی بنانے اور دوبار چائے پینے میں لنچ کا وقت ہوگیا۔ پھر تین بجے سے شام تک گپ شپ کرنے یا کرکٹ پر تبادلہ خیال کرنے میں وقت گزر گیا۔ وقت بھی گزر گیا اور نوکری بھی چلتی رہی۔ زیبا کی فیکٹری میں تو چائے پینے کے لیے باہر جانا بھی نہیں پڑتا تھا۔ اپنی اپنی جگہ پر چائے آتی اور پھر سب اپنے اپنے کام میں جٹ جاتے۔ رضوان نے سوچا کہ کل صبح اسے کالی کوچ سے پٹنہ چلے جانا چاہیے۔

اس رات ہوا میں خنکی تھی اور ٹھنڈک کا احساس ہڈیوں تک ہو رہا تھا۔ لوگ الاؤ کے پاس بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ اس بار دھان کی فصل کمزور ہوئی تھی۔ کچھ لوگ اسے قدرت کی طرف سے مار تصور کرتے تھے تو کچھ لوگ وقت پر کھاد پانی مہیا نہ کرائے جانے کو اس کی وجہ بتا رہے تھے۔ سب کی نظر نھتونی انصاری اور ذکیر کی فصل پر مرکوز تھی۔ آخر ان دونوں کی کھیتی کے لیے کوئی عذاب کیوں نہیں! دونوں پکّے نمازی تھے، حالاں کہ

ایسے اور بھی نمازی تھے جن کی فصلیں خراب ہوگئی تھیں۔ نھونی انصاری حنفی المسلک تھے جب کہ ان کا بیٹا مدینہ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد جماعت اہل حدیث سے متعلق ہوگیا تھا۔ اسی بنیاد پر مولانا لقمان سلفی نے اسے اپنے مدرسہ جامعہ ابن تیمیہ میں استاد کی حیثیت سے بحال کرلیا تھا۔ امام الحق اچھی صلاحیت کا مالک تھا۔ دوسری طرف ذکیر کے چھوٹے بھائی محمد اسرائیل نے مدرسہ کاکوری لکھنو کے بعد دارالعلوم دیو بند سے فراغت حاصل کی تھی۔ اب وہ ہندوؤں کے نرغے میں ہر دوار کی سرزمین پر مدرسہ میں استاد ہوگیا تھا۔ دونوں گھرانے کے افراد بستی کے شرفاء میں شمار ہونے لگے تھے کیوں کہ علم کی روشنی دونوں گھرانوں میں آچکی تھی۔

الاؤ کے پاس بیٹھے ہوؤں میں سے صغیر نے راز فاش کیا:

"ہو توہنی کا جانے گئے۔ ای ڈونورات کے چُراچُرا کے یوریا چھنیٹ تھے"

آپ لوگوں کو کیا معلوم!

(یہ دونوں رات میں چوری چوری کھیت میں یوریا دیتے ہیں۔)

صغیر وا ٹھیکے کہہَ تھے۔ جکیرِ وا آجو لہنڈی دونوایک نمبر کا تیئر ہے۔"

نذیر حسن بول پڑا۔

(صغیر ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ذکیر اور جولہا (نھونی انصاری) دونوں ایک نمبر کے چالاک ہیں۔)

اسی درمیان ساڑھے سات بجے کا پرادیشک سماچار شروع ہوا۔

"یہ آکاشوانی ہے۔ اب آپ اننت کمار سے پرادیشک سماچار سنئے!"

"سُونَ ہو۔ نیوج سونے دَ۔"

(سنیے، ذرا نیوز سننے دیجے)
رے کیسا ریڈیو رکھے ہَس۔ تنکا صاف کرنہ۔
(رے کیسا ریڈیو رکھتے ہو؟ ذرا صاف کرونہ)
مقتدر نے اپنے ریڈیو کی آواز صاف کرنے کی کوشش کی مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ پھر بھی آواز اس لائق ہو گئی کہ جملے سمجھ میں آسکتے تھے۔

"چھوڑنہ مَر دے خالی ہلاّ کریہہ کی سُونے دیہہ۔
(چھوڑیے نہ صرف ہنگامہ کیجیے گا کہ سننے بھی دیجیے گا؟)
رضوان الاؤ سے ذرا الگ کرسی پر بیٹھا ہوا ادھر نیوز ہی کی طرف کان لگائے ہوئے تھا۔ نیوز کا یہ حصہ آیا۔

"سیتا مڑھی میں ہوئے دنگوں پر پوری طرح نینتر ن پالیا گیا ہے۔ آج بتیا کے محلّہ "گنج نمبر دو" میں ایک اگر بھیڑ نے کچھ گھروں اور دکانوں کو آگ لگا دی! کسی اپیریہ گھٹنا کا سماچار نہیں ہے۔"

یہ نیوز سن کر ایک بار پھر وہاں الاؤ کے پاس بیٹھے لوگوں میں کھلبلی سی مچ گی۔ دو آدمیوں میں بحث شروع ہو گئی۔

"ای تَ جرور مسلمان سب کا کام ہے۔"
"تو ای بات کیسے کہہ سکَ تھَس؟"
(تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو)
"ہندو محلّہ میں ہندو کاہے لا آگ لگاوے جتئی! گنج نمبر دو میں تَ خالی ہندو سب رہ تھئ۔
(ہندو محلّہ میں ہندو کیوں آگ لگانے جائے گا گنج نمبر دو

میں صرف ہندو رہتے ہیں)

رے تو کا جانے گئس ای سیاست کو؟

(تم کیا جانو گے اس سیاست کو؟)

"اچھا تُو ہے جانَ، تو بڑکا نیتا ہ!

(اچھا آپ ہی جانیے آپ بڑے نیتا ہیں)

"رے ای چھونڑا بڑا ٹھتھرہی"

(رے یہ لڑکا تو بڑا ضدی لگتا ہے!)

ایک بار پھر رضوان کی سوچ میں موجوں کے تھپیڑے اٹھنے شروع ہو گئے۔ کچھ لوگ وہاں الاؤ کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے اور کچھ لوگ پھونک مار کر شعلہ بھڑکانے اور اپنی کھلی پنڈلیوں اور ٹانگوں کو سینکنے میں مصروف ہو گئے۔ رضوان بھی وہاں سے اٹھ کر گھر کے اندر چلا گیا۔ گھر میں بیوی نے کھانے کو کہا تو ٹال گیا کہ بعد میں کھالے گا ابھی وہ آرام کرنا چاہتا ہے۔ بستر پر دراز ہو گیا۔ بیوی نے سمجھا طبیعت ناساز ہے۔ اس نے سر دبانا چاہا تو منع کر دیا۔ اب وہ سوچ میں پڑ گیا کہ ایسا نہ ہو کہ اس فساد کی زد میں اس کے دوست راجیش کا گھر خاندان بھی آگیا ہو۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ کل صبح کالی کوچ سے جائے گا ضرور مگر موتیہاری ہوتا ہوا وہ پٹنہ نہ جا کر بتیا جائے گا تاکہ صورتحال کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔ کچھ کشمکش سے گزرنے کے بعد اسے نیند آگئی۔ بیوی نے جب نماز عشا کے لیے جگایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وضو کر کے اس نے بستر پر ہی نماز پڑھ لی۔ بیوی نے دستر خوان لگایا۔ بڑی مشکل سے اس نے ایک روٹی کھائی اور لیٹ گیا۔ بیوی نے پٹنہ جانے کے لیے کچھ کھانے کی چیزیں تیار کر لی تھیں۔ رضوان نے سونے سے پہلے اپنی بیوی کو بتا

دینامناسب سمجھا کہ کل وہ پٹنہ نہیں بلکہ بتیا جائے گا۔ بیوی نے وجہ دریافت کی تو رضوان نے جواب دیا:

''آج بتیا میں فساد ہوگیا ہے۔ معلوم نہیں میرے دوست راجیش کا کیا حال ہے۔ وہاں جاکر حال خبر لینا ضروری ہے۔''

''مگر اس فساد کے ماحول میں آپ نہیں جاتے تو اچھا تھا''

بیوی نے ہمدردانہ لہجے میں اپنا رد عمل ظاہر کیا۔ حالاں کہ اسے پتہ تھا کہ رضوان جو سوچ لیتا ہے اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ تھوڑی دیر دونوں گفتگو کرتے رہے پھر سو گئے۔

بارہ بجے شب کے آس پاس کھپریل چھت میں چوہوں کے دوڑنے اور کچکچانے کی آوازیں ابھریں۔ یہاں تک کہ دو چوہے لڑتے لڑتے مچھر دانی پر گر پڑے۔ رضوان اور اس کی بیوی دونوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ رضوان نے اپنے سرہانے سے ٹارچ اٹھاکر جو ماری تو دونوں چوہے مچھر دانی سے باہر جاگرے اور کچ کچ کرتے ہوتے کہیں بل میں گھس گئے۔ رضوان نے اٹھ کر چوہے دان میں روٹی لگا کر بڑے بکس پر رکھ دیا اور آکر سو رہا۔ آنکھ لگنے کے کچھ دیر بعد ہی چوہے دان کی آواز ہوئی۔

''لگتا ہے پڑگیا'' رضوان بولتا ہوا تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ بیوی بھی جاگ گئی۔ چوہے دان میں ایک موٹا سا چوہا موجود تھا۔ رضوان نے اسے چوہے دان سے نکال کر کمرے سے باہر کر دیا۔ رضوان نے سوچا کہ چوہے تو ایک ہی ساتھ رہتے ہیں مگر ان میں لڑائی کس بات پر ہوتی ہے۔ کیا جنگ تمام مخلوقات کا مقدر ہے۔ اسے خیال آیا کہ جب اشرف المخلوقات معمولی بات پر ایک دوسرے کا خون بہا سکتا ہے تو پھر ان بے چارے چوہوں کا کیا ذکر!

رضوان نے چوہے دان میں دوبارہ روٹی رکھ کر بکس پر رکھ دیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد ایک چوہا پھر آ گیا۔ رضوان نے لحاف سے نکل کر چوہے کو باہر کیا اور یہ عمل چار بجے تک جاری رہا۔ اس طرح پانچ چوہے رات میں مارے گئے۔ رضوان کو لگا جیسے اس کے گھر کا سارا عذاب ختم ہو گیا۔ کبھی کبھی معمولی حیثیت کی چیز انسان کے لیے پریشانی کا باعث بن جاتی ہے۔ رضوان کے اس گھر میں چار طرح کی پریشانیاں تھیں۔ روشنی کا فقدان، ہوا کا نہ آنا، چوہوں کی بہتات اور برسات کے موسم میں چھت کا برسنے کی طرح ٹپکنا...... روشنی کے لیے دن میں بھی لالٹین یا چراغ مستقل جلتا رہتا تھا کہ بغیر اس کے اس گھر میں کوئی سامان دکھتا بھی نہیں تھا.......... گویا دونوں میاں بیوی دن رات خوشی خوشی کاربن ڈائی آکسائیڈ اور کاربن مونو آکسائیڈ Inhale کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ جب بارش ہوتی تو مچھر دانی کے اوپر ڈونگے اور پتیلیوں کا بازار سا لگ جاتا۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ ان برتنوں کے وزن سے مچھر دانی کی ڈوری ٹوٹ جاتی اور پانی گر جانے سے پورا بستر خراب ہو جاتا۔ اس ماحول میں شب بیداری کے علاوہ کیا چارہ ہو سکتا تھا۔ ہوا آنے کا یہ حال تھا کہ باہر جب خوب تیز آندھی چلتی تو کمرے کے اندر تھوڑی سی ہوا دھوکے سے کسی چھید سے آجاتی۔ گویا یہ کمرہ اس آدمی کی طرح تھا کہ دنیا اور اطراف میں تو ہنگامہ برپا ہے اور قیامت خیز مناظر ہیں مگر اس کے اندر ایک سمندر کا سا سکوت ہے۔ اس طرح کے لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں جس طرح یہ سمندر خوش نصیب ہوتے ہیں کہ لاکھوں ندیاں شور و ہنگامے کو، موجوں اور طغیانیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ان گنت نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی آتی ہیں اور ان کے دامن میں آنسو کے گرم قطروں کی طرح جذب ہو جاتی ہیں۔

۱٦

سورج کی ٹکیا آج کچھ زیادہ سرخ ہو گئی تھی ۔ ندی کے خون آلود پانی پر جب سورج کی کرنیں پڑی ہوں گی تو اس کا انعکاس ہوا ہو گا جس سے یہ ٹکیا اور بھی سرخ ہو گئی ہو گی ۔ سورج جو سیتا مڑھی کی طرف سے طلوع ہوا تھا اور بتیا کی طرف مغرب میں اپنی سرخ کرنیں بکھیر رہا تھا...... رضوان کا گھر دونوں کے درمیان میں واقع تھا۔ رضوان نے صاف دیکھا کہ سرخ کرنیں اس کے گھر سے ہو کر گزر رہی ہیں ۔ آج وہ کالی کوچ سے موتیہاری نہیں جاسکا۔ اس لیے اب اسے گرہنوا اسٹیشن سے بذریعہ ریل بتیا جانے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ اس نے اپنے دوست ظفر سے جب بتیا جانے کا ذکر کیا تو وہ بھی ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔

صبح کے ناشتے کے بعد رضوان اور ظفر سائیکل سے گرہنوا پہنچے۔ ظفر نے اپنی سائیکل اپنے ایک دوست کے گھر پر گرہنوا ہی رکھ دی ۔ وہاں پلیٹ فارم پر بہت کم مسافر تھے ۔ بتیا کے فساد نے ایک بار پھر خوف و ہراس کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ وہاں چار پانچ مسافروں کے علاوہ دو تین سبزی والیاں تھیں ۔ یہ عورتیں رکسول سے دربھنگہ تک کا سفر کرتی تھیں۔ ان میں کچھ دو نمبر بھی ہوا کرتی تھیں اور کچھ کو ریلوے پولس جبراً دو نمبر بنا دیتی تھی۔

ظفر نے اس طرح کے کئی واقعات دیکھے اور سنے تھے۔ پولس والے ان عورتوں سے چار آنے، آٹھ آنے یا ایک روپیہ دو روپے وصول کیا کرتے تھے۔اس سے زیادہ کی سکت ان سبزی والیوں میں تھی بھی نہیں۔ کئی بار دیکھا گیا کہ ریلوے پولس کا کوئی جوان جب کسی سبزی والی کی ٹوکری اس کے سر پر اٹھاتا تو اس کا ہاتھ بڑی خاموشی سے سیدھا اس کے سینے کی طرف بڑھ جاتا۔ دھیرے سے اس کے منھ سے سسکی ابھرتی اور پھر ایک مجبور اور خفیف سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل جاتی۔کچھ اسمگلر بھی ان سبزی والیوں سے بڑا کام لیا کرتے تھے۔رکسول جو نیپال کا بارڈر تھا وہاں سے اکثر اسمگلروں کا کاروبار ہوا کرتا تھا۔

آٹھ بجے والی ٹرین ٹھیک ساڑھے نو بجے گرہنوا اسٹیشن پر آگئی۔ٹرین کی آواز میں بھی ایک طرح کا درد تھا۔رضوان کی نظر کوئلہ جھونکتے ہوئے آدمی پر گئی اور سرخ ایندھن سے ٹکرا کر لوٹ آئی۔ رضوان اور ظفر نے بالکل پیچھے کے ڈبے میں بیٹھنا پسند کیا ......اس سرخ ایندھن سے دور، بہت دور۔راستے میں ظفر نے کچھ غزلیں سنائیں۔وہاں بیٹھے مسافروں کو اس نے فرمائشی گیت بھی سنائے۔اس طرح ایک پر کیف ماحول بنانے کی کوشش جاری رہی۔رضوان کا ذہن اس وقت راجیش کی طرف تھا۔ پہلی بار یہ دونوں جب وہاں گئے تھے تو راجیش کے گھر پر کھانا کھانے کے بعد اسی کی دی ہوئی دھلی چادر پر نماز پڑھی تھی، تب جیسے سب کچھ نارمل تھا...... رضوان کا ذہن پٹری پر چل رہی گاڑی سے زیادہ، بہت زیادہ تیز چل رہا تھا۔ اس کا بدن ریل میں تھا مگر ذہن کب کا بتیا پہنچ چکا تھا۔شاید دو گھنٹے پہلے بلکہ اس سے بھی پہلے۔اس لیے کہا جاتا ہے کہ جسم اور ذہن میں عمل کے اعتبار سے کسی طرح کی ہم آہنگی نہیں ہوتی۔ جسم

مسجد میں ہوتا ہے اور ذہن مینابازار میں ۔ایک بہت ہی موٹا آدمی جو دس منٹ میں گھر سے اپنے دروازے تک چل کر آتا ہے اس کا ذہن ایک لمحے میں بوسنیا، جاپان ،روس،امریکہ اور عراق کی سیر کرلیتا ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے رضوان پر غنودگی طاری ہوگئی تھی۔ بتیا پہنچنے پر ظفر نے ٹوکا...... ''آؤ ہم پہنچ گئے......'' ظفر نے خود بیگ اٹھالیا۔دونوں پلیٹ فارم پر آگئے۔ یہاں بھی سناٹا تھا۔ ظفر نے اس سفر کے لیے ٹکٹ نہیں لیا تھا۔رضوان کے کہنے پر بھی اس نے صرف رضوان کی خاطر ایک ٹکٹ لے لیا تھا۔اس نے بارہ سال میں بیر گنیاسے سیتامڑھی آتے جاتے ٹکٹ لینے کی کبھی غلطی نہیں کی تھی اور آج تو خیر اس سناٹے کے عالم میں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں تھا کہ تمھارے منھ میں کے دانت ہے۔ اس لیے ٹکٹ لو یا مت لو، ریل بھاڑے میں ہر سال اضافہ تو ہوتا ہی ہے ۔پھر کیا پاگل کتّے نے کاٹا ہے جو ٹکٹ خرید کر سفر کیا جائے ۔ظفر کا نظریہ کچھ ایسا ہی تھا۔

دونوں پلیٹ فارم سے باہر آگئے۔ باہر دو تین رکشا والے اور ٹم ٹم والے موجود تھے ۔سب نے غنیمت کی سواری جان کر آواز لگائی۔ ظفر نے ایک رکشا والے سے یہاں کے حالات دریافت کیے تو معلوم ہوا کہ رات کو کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا، آج صبح آٹھ بجے سے سب معمول پر ہے۔ مگر دیکھنے سے ایسا لگتا تھا کہ اندر اندر ماحول میں اب بھی کشیدگی ہے۔
رضوان اور ظفر ایک رکشا پہ سوار ہوگئے۔رکشاوالے نے پوچھا......

''کہاں چلیں بابو جی ؟''

''گنج نمبر دو''

''اوہاں تو طوائف کا کوٹھا ہے بابو جی ۔آپ لوگ تو

سریف لگتے ہو"۔

"ہاں چلو...... اس محلے میں ہمارے دوست راجیش کا گھر ہے۔"

رکشا چلتا رہا اور باتیں ہوتی رہیں ۔ایک جگہ چند نوجوانوں نے رکشارکوایا۔

"روکنا جی، رکشاروکنا"!

رضوان اور ظفر دونوں پہلے گھبرائے مگر دونوں نے ہوشیاری سے کام لیا۔وہاں پاس میں ایک مندر دیکھا۔نوجوانوں نے اپنی پیشانیوں پر قشقے کھینچ رکھے تھے ۔ادھر ادھر کچھ ادھیڑ عمر کے لوگ دھوتی پہنے ہوئے کھڑے تھے۔دو تین جوانوں نے سر پر "بول بم" والا گمچھا لپیٹ رکھا تھا۔ ایک بوڑھے نے نوجوان میں سے ایک کا نام لے کر پکارا......

"چھوڑدے سُریس جاتری لوگ سے کیا لینا دینا"!

یہ سن کر ظفر نے فوراً سب کچھ بھانپ لیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ یہاں ہندو نوجوان مسلمانوں سے انتقام لینے کا ارادہ ضرور رکھتے ہیں ۔ایک نے پوچھا......

"آپ لوگ کہاں سے آرہے ہیں ؟"

"ہم لوگ بیر گنیا سے آرہے ہیں ۔"

کیا نام ہے......؟

"میں پنکج ہوں اور یہ میرا دوست ہے سدھیر !"

ظفر نے برجستہ جواب دیا۔

"کہاں جارہے ہیں آپ لوگ ؟"

"گنج نمبر دو میں جانا ہے۔ وہاں میرا دوست راجیش ہے۔
دنگا کا سن کر اس کا سماچار لینے آگئے ہیں ۔"

"ٹھیک ہے جایئے آپ لوگ ، مگر وہاں گنج نمبر دو سے
پہلے جنگی مسجد کے آس پاس مسلمانوں کی آبادی ادھک
ہے اگر کچھ لوگ رکشا روک کر نام پوچھیں تو مُسلمیا نام
بتا دیجیے گا، کیا ٹھکانہ سالوں کا!"
" آپ چنتا نہ کریں ہم لوگ ایسا ہی کریں گے ، کسی
طرح راجیش تک تو پہنچنا ہے ......" ظفر نے جواب دیا۔
رکشا جب وہاں سے بڑھا تو دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ رکشا والے نے
پوچھا......
"بابو جی !اپنے ہی دیس میں ،اپنے ہی گاؤں گھر میں کب
لے آدمی اپنا نام چھپاتا رہے گا......؟"
ظفر نے ٹوہ لینے کی غرض سے رکشا والے سے پوچھا......
"اچھا بتاؤ تمھارا نام کیا ہے ؟"
"ہمرا نام کھسیریا ہے ......"
رضوان اور ظفر دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔"
سالا یہ بھی کوئی نام ہوا۔ "کھسیریا"۔ اس سے تو کچھ بھی
معلوم نہ ہوسکا کہ تو ہندو ہے کہ مسلمان !"
"بابو جی ہم تو ہندو کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔"
باتوں باتوں میں جنگی مسجد کے علاقے میں رکشا پہنچ گیا۔ واقعی
یہاں بھی کہیں کہیں نوجوان اور ادھیڑ عمر کے لوگ جمع تھے۔ آخر کار ایک
جگہ رکشا روک ہی لیا گیا......
"کہاں سے آرہے ہیں آپ لوگ ؟"
"بیر گنیا سے آرہے ہیں"......رضوان نے کہا۔

"کیا نام ہے ؟" ایک نوجوان نے پوچھا جس کے سر پر گول ٹوپی تھی اور جس پر چاند اور تارہ بنا ہوا تھا۔

رضوان نے تعارف پیش کرتے ہوئے کہا......

"مجھے رضوان کہتے ہیں اور یہ میرے دوست ہیں ظفر"

ایک دوسرے نوجوان نے پھر سوال کیا......

"ادھر کہاں جارہے ہیں آپ لوگ ؟"

رضوان نے جوان دیا......

"گنج نمبر دو میں میرا ایک دوست ہے"

"ادھر مت جایئے، حالات صحیح نہیں ہیں ۔ آپ لوگ یہیں رک جایئے"!

رضوان نے جواب دیا......

'شکریہ آپ کا۔ مگر ہمارا وہاں جانا ضروری ہے"

ذرا الگ بیٹھے ادھیڑ عمر کے ایک داڑھی والے شخص نے بیڑی کا کش لیتے ہوئے کہا......

"ارے اکبر تو سمجھتا نہیں۔ بحث کیے جارہا ہے۔ یہ لوگ جھوٹ بول رہا ہے۔ نام بھی بدل کر بتارہا ہے۔ یہ لوگ ہندوؤں کے لیے جرور کچھ ہتھیار اور گولی بارود لائے ہوں گے .... بھائی جرار کسا سے اترنا!"۔

وہ آدمی قریب آگیا۔ دونوں رکشا سے اتر گئے۔ اتنی دیر میں وہاں تیس چالیس لوگ جمع ہوگئے۔ طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ دونوں پر سوالوں کی بوچھار ہونے لگی......

"ارے اگر یہ مسلمان ہیں تو ان سے کلمہ پڑھوا کر دیکھو"

"ہم تو کہتے ہیں کہ حضورؐ کے دادا کا نام ہی بتادیں یہ لوگ!"

"چار خلیفوں کے نام ہی بتادیں......"!

"سیدھی بات یہ ہے کہ ان دونوں سے دعائے قنوت اور جنازے کی تینوں دعائیں سن لو، سب پتہ چل جائے گا"۔

آخری سوال چالیس سالہ مولوی نما شخص نے کیا تھا۔شاید اس آدمی کی نظر میں انہی دعاؤں سے مومن کا شناخت نامہ تیار ہوتا ہوگا۔ رضوان کو اندر اندر غصہ بھی آرہا تھا۔ اس نے کہا......

"دیکھیے ابھی جانے دیجیے۔ ادھر سے واپسی میں جتنا امتحان لینا ہوگا لے لیجیے گا۔"

ظفر سے رہا نہ گیا۔ اس نے سوچا کیوں نہ سوالوں کے جواب دے کر خود کو آزاد ہی کرالیں۔ اس نے جواب دینا شروع کیا۔

"کلمہ سنیں گے آپ لوگ ؟ تو سنیے۔ لا الٰہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ ، حضور کے دادا کا نام جاننا چاہتے ہیں آپ! ان کے داد کا نام عبدالمطلب تھا......

"چار خلیفوں کے نام اس طرح ہیں...... حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت عمرؓ فاروق، اور حضرت علیؓ......"

"دعائے قنوت اور جنازے کی تینوں دعائیں بھی سن لیجیے......"

ظفر نے سب کچھ تیزی سے بغیر کسی جھجک کے سنادیا...... رضوان نے بھی ایک گزارش پیش کی......

"ایک سوال ہے ، جس کا جواب میں واپسی میں سنوں گا...... قرآن میں کہا گیا ہے...... واللہ لایحب الفساد......

ایک آیت اور یاد آئی۔ "وَلَا تمشِ فِی الارض مَرحا...... ان
دونوں آیتوں کا پس منظر اگر آپ میں سے کوئی آدمی
تفصیل سے بتا سکے تو میں شکر گزار رہوں گا......"

یہ سن کر سب کو یقین ہو گیا کہ یہ دونوں مسلمان ہیں اور پڑھے لکھے ہیں۔ البتہ مسلمانوں کے اس رویے پر رضوان اور ظفر کو ذرا غصہ بھی آیا۔ وہ جانتے تھے کہ فساد کا رد عمل پورے دیش میں رونما ہوتا ہے۔ اگر مسلمان اس بات کو نہیں سمجھتے تو جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں گے وہاں مسلمان ہندوؤں کے جبر کا شکار ہوں گے۔ سیتامڑھی اور بھاگل پور کے فسادات ہمارے سامنے ہیں۔ کبھی کبھی رضوان کے جذبات بھی ہندوؤں کے خلاف مشتعل ہو جایا کرتے تھے۔ مگر حالات نے دھیرے دھیرے اس کے اندر نامعلوم طور پر ایک طرح کی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔اب اس کے نزدیک پیغام انسانیت اور آپسی میل محبت وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ رضوان انسانیت کُش اقدام کو خواہ کسی فرقے کی طرف سے ہو بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کی نظر جب کسی مسلم کی دکان پر لگے اسٹیکر پر پڑتی کہ ...... "فخر سے کہو ہم مسلمان ہیں" یا کہیں کسی ہندو ہوٹل کے اندر ایسا ہی اسٹیکر نظر آتا جس پر لکھا ہوتا...... " गर्व से कहो हम हिन्दू हैं " تو اس کے اندر ایک بھونچال سا آجاتا۔ وہ سوچتا دنیا کے تمام فرقوں میں کیا صرف ان دو فرقوں کو اپنے آپ پر فخر کرنے کا حق حاصل ہے ؟ کیا اس دھرتی پر کوئی ایسا فرقہ بھی ہوگا جو اس بات کا عَلم بلند کرے گا کہ "فخر سے کہو ہم انسان ہیں"۔ مگر شاید ایسا کبھی ممکن نہیں، تبھی تو مرزا غالب نے کہا تھا "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا" اپنے اپنے مذہب پر فخر تو بیشک کرنا چاہیے مگر ان باتوں کا اس طرح اظہار

شاید کسی بھی فرقے کے لیے مناسب نہیں۔ رضوان کے ذہن میں مظفر پور کالج کے ، پروفیسر اشفاق انجم کی منطقی گفتگو کا یہ حصہ عود کر آیا......

انھوں نے کہا تھا:

"اگر آپ عبیداللہ خاں اعظمی کی اشتعال انگیز تقریریں ریکارڈ کر کے فروخت کر سکتے ہیں اور عقیدت مندی کے ساتھ سن سکتے ہیں تو پھر سادھوی رتمبھرا اور اوما بھارتی کی اشتعال انگیزی سے گریز کیوں...... ؟ سننا پڑے گا آپ کو!"

اس وقت علم نفسیات کے پروفیسر کا یہ نظریہ بے بنیاد اور متعصّبانہ معلوم ہوا تھا مگر آہستہ آہستہ اس کے تجربات اور مشاہدے نے پروفیسر کے نظریے کو قبول کر لینے پر مجبور کر دیا تھا......

رضوان کے ذہن پر اس طرح کے ملے جلے اثرات ابھرتے رہے۔ اس کا ذہن کبھی سوچ سے خالی نہیں رہتا تھا۔ رکشا والے نے رکشا روکتے ہوئے کہا......

"گنج نمبر دو آگیا بابو جی!"

"اچھا یہیں روک دو، کتنے پیسے ہوئے"

"آٹھ روپیہ بابو جی!"

"آٹھ روپے ؟!"

"بابو جی ہر سمان تَ مہنگے ملتا ہے۔ ہم لوگ کا کریں"

"اچھا یہ لو، ٹھیک ہے نا......"

"جی بابو جی ......"

رکشا والا چلا گیا۔ رضوان اور ظفر نے ادھر ادھر دیکھا۔ عجیب

سناٹا۔ ایک ہُو کا عالم ۔ کیا یہاں کوئی نہیں رہتا۔ یہ جو مندر ہے اس کی دیواریں آگ اور دھوئیں سے کتنی بدہیت ہو گئی ہیں۔ وہ پان کی گمٹی کس طرح جل کر راکھ ہو گئی ہے۔ وہاں جو ایک ادھیڑ عمر کی عورت بیٹھی راکھ کرید رہی ہے شاید وہ بتائے کہ راجیش اور اس کے گھر والے کہاں گئے۔ راجیش کا گھر تو یہاں ہے مگر اس کا حال بھی جھلسے ہوئے مندر کا سا ہے۔ وہاں تو کسی کے رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ظفر نے اس عورت کے پاس جا کر کہا......

"پرنام چاچی!"

اس عورت نے معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا:

"کاہے بوا؟"

"یہاں سے ویدناتھ جی کے گھر والے کہاں چلے گئے۔ گھر تو خالی ہے......"

"دیکھت نیکھیں سارا محلہ جر گئیل۔ مسلمنوا سب کال ای محلہ کے لوٹ پاٹ کے آگ لگا دیلن سَن......سب گھر آدکان جر کے راکھ ہو گئیل......"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ رضوان نے اس عورت کے تاثر میں ایک طرح کا درد محسوس کیا۔ اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"چاچی وہ لوگ کہاں ملیں گے؟"

اس عورت نے اپنے پلّو سے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا......

"اوجے رنڈیا کے گھر وا نیکھیں او سے تنکا آگے جا کے ایگو چوراہا ملی اونہے اجے بابو کے گھر میں مل جیھن سَن۔ ان کر سمبندھی ما او لوگ......"

دونوں وہاں سے پرنام کرتے ہوئے چلے۔ طوائفوں کے گھروں کے پاس سے گزر رہے تھے۔ ظفر ادھر ادھر کھڑکیوں کی طرف دیکھتا جارہاتھا۔ ایک بالکنی سے ایک طوائف نے ظفر کو اشارہ بھی کیا۔ اس کے قدم ایک لمحے کو رکے۔ رضوان کو شک ہوا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ظفر کی نگاہیں اوپر کسی سے متصادم تھیں۔ رضوان نے طوائف کو مسکراتے دیکھا تو ظفر کو گالی دی:

"سالا تُو نہیں سدھرے گا!"

"ہم کہاں کچھ کر رہے ہیں"

"تو پھر سیدھا چل۔ یہ کیا اُلو کی طرح ادھر ادھر دیدہ گھماتا رہتا ہے۔ سالا چُھدر کہیں کا......"

"اچھا چلو۔ بہت تقریر مت جھاڑو......"

چوراہا جلد ہی آگیا۔ وہاں ایک پان کی گمٹی تھی جس پر ایک چھوٹا بچہ بیٹھا پان چبائے جارہاتھا۔ اس کی عمر بارہ تیرہ برس سے زیادہ نہ رہی ہوگی۔ ظفر نے اس کے پاس جاکر دریافت کیا......

"منّا! اجے بابو کا گھر کون سا ہے؟"

"اوجے سامنے لال رنگ کا بلڈنگوا دیکھ رہے ہیں، اوہے ہے۔ پان کھایئے گا آپ لوگ؟"

"ہم لوگ پان نہیں کھاتے!"

"پان نہیں کھاتے ہیں کھالی پتے پوچھتے ہیں!"

یہ سن کر دونوں کو ہنسی چھوٹ گئی۔ دونوں بتائے گئے لال بلڈنگ کی طرف بڑھے۔ ظفر نے کہا:

"رضوان! اس چھوٹو کی بات سنتے ہو؟"

''ہاں آج کل تو پیدا ہوتے ہی عقل آجاتی ہے اور یہ تو
بازار کا رہنے والا ہے جہاں عقل اور چالاکی سے پیسے
کمائے جاتے ہیں۔''

دونوں لال رنگ کی عمارت کے پاس آگئے۔ پھاٹک کے اندر ایک اسمارٹ سا نوجوان کرسی پر بیٹھا دھوپ تاپ رہا تھا۔اس کے ہاتھ میں ہندی اخبار ''آج'' تھا۔ ظفر نے قریب جاکر کہا:

"Excuse me"

"yes"!

''کیا یہاں راجیش سے ملاقات ہوسکتی ہے؟''

''ہاں ہو جائے گی، مگر آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟''

''ہم لوگ بیر گنیا سے آئے ہیں ...... راجیش کے دوست ہیں''

''آیئے اندر آجایئے ......''

دونوں اندر داخل ہوگئے۔

''بیٹھیے''

خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے نوجوان اٹھ کر اندر خبر دینے چلا گیا...... دونوں کو وہاں بیٹھتے ہوئے عجیب سی اجنبیت کا احساس ہوا۔ یہ وقفہ رضوان کی سوچ اور ادھیڑ بن کے کام آیا۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ انٹر میڈیٹ میں تھا تو گاؤں کی فٹ بال ٹیم کا ایک اچھا کھلاڑی تھا۔ ایک بار میچ کھیلنے یہ ٹیم ایک ہندو اکثریت گاؤں اٹھموہان گئی تھی۔ جب میچ کا کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا تو پوری ٹیم وہاں رک گئی تھی کہ صبح دوبارہ میچ ہونا تھا۔ رات میں وہاں کے ہندو نوجوانوں نے خوب خاطر تواضع کی تھی۔ عزت اور سمان دیا تھا۔ صبح میچ ہوا اور چھ گول سے جیت ہوئی تھی۔ ٹیم کے اہم

کھلاڑیوں میں اعظم بھائی، مولوی نیاز احمد، شیر محمد، عقیل بھائی، انیس بھائی، پرویز بھائی، فہیم بھائی، عبدالصبور ماموں اور ڈوکن وغیرہ تھے۔ شیر محمد ہمیشہ بغیر بوٹ پہنے ہی کھیلا کرتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ بوٹ والے بھی ذرا ڈرتے ڈرتے ہی اس کے قریب جاتے تھے۔ وہ کشتی لڑنے والا پہلوان بھی تھا۔ اس نے روزے کی حالت میں رمضان میں ایک بار نیپال کے گئور بازار میں تین پہلوانوں کو باری باری سے مات دے دی تھی۔ ایک بار جب اس کے چیلے (شاگرد) رفیق نے دنگل میں اسے چت کر دیا تب سے کشتی لڑنا ہی چھوڑدیا...... رضوان اٹھموہان کے ہندوؤں کے برتاؤ سے جتنا خوش تھا اتنا ہی دکھ اسے کرمو میچ کے بارے میں سوچ کر ہوا۔ میچ شروع ہونے سے پہلے ہی ہندوؤں نے اینٹ پتھر جمع کر لیے تھے۔ رضوان کے گاؤں کی ٹیم جب جیتنے لگی تو کسی بات پر تُو تُو مَیں مَیں ہو گئی۔ فوراً بھگدڑ مچ گئی اور پھر کرمو اگاؤں کی طرف سے پتھراؤ شروع ہو گیا۔ ہندو مسلم فساد کا سا ماحول پیدا ہو گیا۔ رضوان اس وقت ہمیشہ اپنے پاس غلیل اور شیشے کی گولیاں رکھا کرتا تھا۔ اس نے بھی اس مارا ماری میں ہندوؤں کے غول پر اپنی تمام تر شیشے کی گولیاں خرچ کر ڈالی تھیں۔ جب کچھ نہتّے نوجوانوں نے مہاویری جھنڈے کو اکھاڑ کر لڑنے کی تیاری شروع کر دی تو ایک ادھیڑ عمر کا ہندو وہاں ہاتھ جوڑے ہوئے حاضر ہوا کہ ''ای ہمر دیوتا با'' اس بات پر رضوان کے گاؤں کے بھگوانی بیٹھا نے جو خود ایک ہندو تھا، اس ہندو کے سر پر ایک زوردار لاٹھی دے ماری جس سے وہ تھر ا کر گرا اور بیہوش ہو گیا۔ اس کے بعد وہاں کا ماحول اور بھی خراب ہو گیا...... بھگدڑ مچ گئی۔...... افراتفری، جیسے نفسی نفسی کا عالم ہو......

''سالا دن رات کہاں کھویا کھویا سا رہتا ہے، دیکھو راجیش

کے فادر آرہے ہیں" ظفر نے رضوان کے کہنی ماری۔

دونوں نے کھڑے ہو کر پرنام کیا...... "پرنام چاچا"

"خوش رہو"

"کہو رضوان کیسے ہو......؟"

"جی ٹھیک ہیں ہم لوگ۔ کل شام یہاں فساد کا سن کر بہت فکر ہوئی ۔ اللہ نہ کرے آپ لوگوں کو کچھ ہوا ہو، گھر پر گیا تو وہاں سب کچھ...... "رضوان اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔

"ہاں بیٹے! کیا کہیں اس دیش میں ایک پل کو شانتی نہیں ہے ...... کیا ہندو کیا مسلمان، سب اپنی اپنی عزت بچانے کی دھن میں مارے مارے پھرتے ہیں............اور یہ سب گندی سوچ رکھنے والے راج نیتاؤں کا پھیلایا ہوا جال ہے"۔

ظفراور رضوان سنجیدگی سے وید ناتھ جی کی نپی تلی باتیں سنتے رہے۔

"انکل راجیش نہیں ہے کیا......؟"

"ہاں ہے......دکان پر گیا ہے ، ابھی آجائے گا۔ آج تو اس کا کھانا بھی نہیں گیا ہے اس لیے آتا ہی ہوگا......"

اتنی دیر میں اس گھر کا وہ نوجوان بھی آگیا جس نے دونوں کو وہاں بٹھایا تھا۔ وید ناتھ جی نے تعارف کراتے ہوئے کہا......

"امیش یہ راجیش کے دوست ہیں...... رضوان اور ظفر، ان لوگوں کو جلپان تو کراؤ...... اور ہاں دکان پر گڈو کو بھیج دو کہ راجیش جلد آجائے ، ہو سکتا ہے کہیں دیر

کردے"۔

"انکل! ہم لوگ وہیں دکان پر جاکر مل لیں گے۔ شام کی گاڑی سے ہم لوگوں کو واپس جانا بھی ہے"۔

"نہیں بیٹے، تھوڑا دم تو لے لو، راجیش ابھی آجائے گا...... تم لوگ بیٹھو میں ابھی آتا ہوں"

اس لفظ "بیٹے" میں کتنی اپنائیت تھی۔ کیا اس کی معنویت میں تبدیلی آگئی ہے؟ اگر سب کچھ وہی ہے تو سب کچھ بجھا بجھا سا کیوں لگ رہا ہے جیسے زمین سے آسمان تک مایوسیوں کی منحوس کرنوں نے ایک جال سا بن دیا ہو...... اُف، کیا ہے یہ سب! رضوان قدرے مضمحل تھا۔ ویدناتھ جی کے کہنے پر وہ رک گیا۔ گڈو راجیش کو بلانے دکان پر چلا گیا اور اُمیش نے پانی سے بھرے دو گلاس لاکر رضوان اور ظفر کے سامنے رکھ دیے۔ دونوں نے ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھا۔ کیا یہ پانی مشکوک ہو سکتا ہے۔ کیا اس گھر کے سارے لوگ ویسا ہی دل رکھتے ہوں گے جیسا کہ ویدناتھ جی رکھتے ہیں۔

"میں تو نہیں پیوں گا۔ ایسے پیاس بھی نہیں ہے"۔

"میں تو پی لوں گا ورنہ یہ شک پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم نے کچھ غلط سوچ کر ہی پانی نہیں پیا...... تو بھی تھوڑا سا...... ایک گھونٹ ہی سہی، پی کر چھوڑ دے۔"

رضوان نے ظفر سے کہتے ہوئے گلاس اٹھایا اور آدھا سے زیادہ پی گیا۔ ظفر نے کہا......

"کیا ضروری ہے کہ دونوں پئیں۔ ایک کے پی لینے پر بھی شبے کی گنجائش نہیں رہ جاتی"

"ٹھیک ہے تو مت پی......"

دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ راجیش سائیکل سے حاضر ہو گیا۔ رضوان اور ظفر کو دیکھ کر وہ قدرے حیرت زدہ ہوا۔ پھر دونوں سے باری باری گلے بھی لگا۔ رضوان نے گلے لگتے ہوئے کہا......

"یہ سب کیسے ہو گیا راجیش، کل پرادیشک سماچار میں یہاں کے فساد کا سن کر مجھ سے رہا نہ گیا......"

راجیش نے رضوان کے اس جملے میں اپنائیت کی ایسی گہرائی محسوس کی کہ کچھ لمحے کو اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ ٹکر ٹکر رضوان کی طرف دیکھتا رہا، پھر اچانک اس کے جذبات کا جیسے بند ٹوٹ گیا۔ وہ ایک دم سے پھوٹ پڑا اور رضوان سے دوبارہ لپٹ گیا..........

"نہیں راجیش، یہ کیا......؟ تم تو پڑھے لکھے ہو اور پھر یہ سب تو ہمارا تمہارا مقدر ہے۔ اس دیش میں پیدا ہونے کا یہ بھی ایک طرح سے ٹیکس ہے ...... دھیرج رکھو راجیش!"

رضوان کے اس جملے نے راجیش کی فکر پر پڑے جالے کو صاف کرنے کا کام کیا۔ مگر ایسا واقعی ہوا، پورے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ راجیش نے محسوس کیا کہ وہ کسی اندھیرے غار میں بند ہے جہاں اچانک ایک جگنو چمک کر روشنی پھیلا گیا ہے جیسے آنکھوں پر پڑی کہر کو سورج کی تابناک کرنوں نے خود میں ضم کر لیا ہو۔

"بیٹھو رجوان، جفر بیٹھو، میں اندر سے آتا ہوں۔"

"بیٹھو راجیش! کچھ کرنے دھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم لوگ شام کی گاڑی سے چلے جاتے تو اچھا تھا

ورنہ گھر پر لوگوں کو فکر ہو جائے گی۔ ایک ہفتے کے اندر پھر خبر خیریت لینے آجائیں گے۔ ایسے یہ ایک فون نمبر ہے اس پر بات ہو سکتی ہے۔ مجھے اس نمبر پر بلوا کر بات کر سکتے ہو۔ میں اگر پٹنہ چلا بھی گیا تو ظفر گھر ہی پر رہے گا......"

"رجوان کیا یہ نمبر تمہارے گھر کا ہے؟"

نہیں ہمارے یہاں ایک مدرسہ ہے جامعہ ابن تیمیہ، یہ اسی کا نمبر ہے......"

"اچھا ٹھیک ہے۔ ہاں اسی مدرسہ کے بارے میں اکھباروں میں طرح طرح کا نیوج چھپتا ہے، کیا وہاں سچ مچ آئی ایس آئی کا اڈّہ ہے؟"

"یہ سب بکواس اور جھوٹ ہے۔ وہاں صرف دھرم کی پڑھائی ہوتی ہے۔ کچھ بکاؤ پترکاروں نے اس کو ہوا دی ہے اور کچھ کھاؤ پکاؤ نیتاؤں نے......"

"مگر اس پر تو اسمبلی میں ہنگامہ بھی ہو چکا ہے۔"

"راجیش! اسمبلی میں ہنگامہ ہونے سے جھوٹ کو سچ نہیں ثابت کیا جا سکتا۔ تم چلو میں وہاں کا کونہ کونہ گھما کے دکھادوں گا، ایسا کچھ بھی نہیں ہے، کیوں ظفر......؟"

"بالکل .... اس میں کیا چھپانا!"

اسی درمیان امیش پلیٹ میں کچھ ناشتے کی چیزیں لے کر آگیا۔ رضوان نے کہا......

"ارے راجیش یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

اسی درمیان ویدناتھ جی بھی آگئے......

"بیٹے یہ کوئی کھانا تو نہیں ہے، تھوڑا پانی تو پی لو"

"انکل آپ تو خود مصیبت میں ہیں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی"

ظفر نے ہمدردانہ جملہ وضع کیا مگر ویدناتھ جی کا رکھ رکھاؤ پوری زندگی میں مشہور رہا تھا۔ انھوں نے کہا......

"بیٹے اب ایسا بھی کیا کہ مصیبت میں مہمان نوازی کو بھلادیں یہی تو اس گھڑی کی آزمائش ہے۔ لو بیٹے لو۔ کچھ سوچو مت۔"

ویدناتھ جی کی باتوں سے دونوں لاجواب ہو کر رہ گئے۔ ظفر نے سوچا کہ پانی نہیں پی سکا تھا مگر یہاں شرکت نہیں کرنے میں تو خسارہ ہے، پھر یہ کہ کھانے کی اچھی چیزیں بھی ہیں۔ ظفر سب کچھ بھول کر ٹوٹ پڑا۔ رضوان نے دھیرے دھیرے تھوڑا سا کچھ لیا اور پانی کا گلاس اٹھالیا۔

"اور لو بیٹے، تم نے کچھ کھایا نہیں!"

"نہیں انکل، بہت ہو گیا۔ پراٹھے وغیرہ گھر کے بنے ہوئے تھے، ہم دونوں نے ٹرین ہی میں کھالیے تھے"

رضوان نے توجیہ پیش کی مگر ظفر اب بھی سنّت ادا کرنے میں مصروف تھا۔ سنت ادا کر کے اس نے پانی پیا، ڈکار لیا اور "الحمدُ للہ" کہتے ہوئے راجیش سے سرگوشی کی......

"راجیش نماز کا وقت ہو گیا ہے اگر پانی مل جاتا تو وضو کر کے یہیں نماز پڑھ لیتے۔"

راجیش نے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر امیش سے کہا......

"امیش بالٹی میں پانی اور لوٹا لے کر آجاؤ"۔

بالٹی میں پانی آگیا۔ لوٹا آگیا...... دونوں نے وضو کر کے وہیں راجیش کی دی ہوئی چادر پر نماز پڑھی۔ جب یہ دونوں نماز پڑھ رہے تھے تو آس پاس کے ہندو گھروں سے کئی لوگ اس منظر کو بغور دیکھ رہے تھے۔ یہ منظر اس پُر آشوب اور کشیدگی کے ماحول میں واقعی حیرت ناک تھا۔ دونوں نے نماز کے بعد وظیفے پڑھے۔ ظفر کی نظر شاید پہلے اٹھی۔ اس نے رضوان سے کہا......

"کبھی ادھر ادھر بھی نظر اٹھا کر دیکھ لیا کرو"

دعا مانگتے ہوئے رضوان کی نظر سامنے کی چھت کی طرف گئی۔ اس نے دیکھا کہ کچھ عورتیں اور مرد ادھر ہی ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ دونوں وہاں سے اٹھ کر کرسیوں پر آگئے۔ راجیش کی دی ہوئی دھلی چادر سمیٹ کر رکھ دی۔ رضوان کے دل میں علامہ اقبال کا یہ شعر گنگنایا ؂

آگیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

اس کے ذہن پر یہ مصرعہ بھی ابھرا ؂

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اگر اس وقت چاروں طرف سے ہندوؤں نے ان دونوں پر حملہ کر دیا ہوتا تو کیا یہ بے تیغ مومن ان کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ رضوان کو لگا کہ دنیا میں اسی طرح ایک روز مرّہ عمل سبھوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے اور کبھی کبھی بڑے سے بڑا عمل بے اعتنائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی وقت راجیش آگیا......

"پڑھ چکے نماز!"

"ہاں پڑھ چکے۔ اب اگر اجازت ہو تو ہم لوگ چلتے ہیں"

"نہیں رجوان، پتا جی نے بھی روکا ہے اور ہماری تو کھاہس ہے کہ آج تم لوگ رک جاؤ"

"اگر رکنا ہے تو ہمیں گھر فون کرنا پڑے گا، حالاں کہ چلے جاتے تو اچھا ہی تھا۔"

"چلو پاس ہی میں STD بوتھ ہے فون کرلو"

تینوں STD بوتھ پر آگئے۔ وہاں کافی لمبی لائن تھی۔ رات میں سات بجے کے بعد کرفیو نافذ کیے جانے کا اعلان ہو گیا تھا۔ سب اپنے رشتہ داروں کو تازہ صورتحال سے آگاہ کردینا چاہتے تھے۔ بوتھ والا راجیش کا پکا دوست تھا۔ راجیش نے رضوان کا نمبر لکھ کر اس کی طرف بڑھادیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ یا تو اداس تھے یا پھر مسلمانوں کے خلاف آہستہ آہستہ گفتگو کررہے تھے۔ ایک آدمی کے بعد رضوان کا نمبر ڈائل کیا۔نمبر فوراً مل گیا۔ بوتھ والے نے کہا......

"اندر جاکر اٹھالیجیے"

شیشے کے بنے باکس میں رضوان گھس گیا اور اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ باہر جو لوگ دیر سے بیٹھے انتظار کی گھڑیاں گن رہے تھے، انھیں یہ بات بری لگی۔ وہاں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ ہم لوگ اتنی دیر سے بیٹھے ہیں، ابھی ابھی جو آیا اسے چانس دے دیا"۔

"ارے پورا اسنسار بھرسٹ ہے، نیائے کا جمانہ کہاں رہا"

"بیٹھے جھک مارتے رہو"

STD والے سے رہا نہ گیا......

"بھائی ! یہ آپ لوگوں سے پہلے آکر اپنا نمبر دے گئے تھے۔اس وقت ملا نہیں تھا،دوبارہ آئے ہیں۔ ابھی ڈائل کرنے پر لگ گیا تو اس میں نیائے انیائے کی بات کہاں سے آگئی"۔

راجیش سے بھی برداشت نہ ہوا، وہ بھی بول پڑا......

"ہاں یہ نیائے انیائے اسی بہار میں دیکھا جاتا ہے۔ جب کہ یہاں سے ادھک کرپسن بھارت میں کیا سنسار میں کہیں نہ ہوگا"۔

ظفر ہندو کی اکثریت دیکھ کر خاموش تھا ورنہ وہ کب کا مارا ماری کر چکا ہوتا۔ رضوان شیشے کے باکس سے باہر آگیا۔ بائیس روپے ادا کیے اور وہاں سے نکل کر تینوں سڑک پر آگئے۔

رضوان نے راستے میں کہا......

"راجیش آؤ ذرا جنگی مسجد ہوتے چلیں"

"نہیں یار گھر چلتے ہیں"

ظفر نے بھی یہی رائے دی۔

"چلو گھر کی طرف ہی چلتے ہیں۔ خواہ مخواہ راجیش کو دیکھ کر ادھر کچھ تلخی پیدا ہو سکتی ہے۔ اپنا موڈ خراب کرنا کیوں چاہتے ہو۔؟"

"کچھ بھی نہیں ہوگا ، میں ہوں نا...... مسجد کے امام سے کچھ باتیں کر کے وہیں مغرب کی نماز پڑھیں گے، پھر جلد ہی آجائیں گے۔"

رضوان کی ضد اور اس کی خود اعتمادی کے آگے ظفر اور راجیش نے سپر ڈال دی......

"چلو راجیش چلو، اس کی پرانی عادت ہے۔
پکا ضدی...... تم بڑ بڑ کرتے رہو اگر اس کا من نہیں ہوگا تو کون سالا اس کو ہلا سکتا ہے اور اگر اس نے سوچ لیا کہ یہ کام ہونا ہے تو پھر کس کی مجال ہے کہ ٹال دے"۔

"میں ضدی نہیں ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جھوٹ کو جھوٹ اور سچ کو سچ کہتا ہوں......اور یہی بات بہت سے لوگوں کے من سے میل نہیں کھاتی.......... چلو، دیکھنا وہاں کون سا پہاڑ ٹوٹ جاتا ہے...... کوئی آدمی نہیں چاہتا کہ سکون غارت ہو۔ کچھ زہر بونے والے اگر نہ ہوں تو سماج میں ہمیشہ شانتی اور سکون کا ماحول قائم رہے۔"

باتوں باتوں میں تینوں جنگی مسجد کے پاس آگئے۔ رضوان اور ظفر مسجد کے احاطے میں داخل ہوگئے۔ راجیش پس وپیش میں باہر ہی رہ گیا۔ رضوان نے پیچھے مڑ کر راجیش سے کہا......

"آؤ راجیش، آجاؤ...... یہ اللہ کا گھر ہے، مسلمان کا نہیں...... یہاں آگئے تو سمجھو کہ اللہ کے شرن میں آگئے۔"

راجیش نے کچھ توقف کے ساتھ کہا......

"آپ لوگ نماج پڑھ کر آیئے ہم گھر چلتے ہیں"

اس بار ظفر نے پیچھے مڑ کر راجیش کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا:

"آجاؤ بھئی آجاؤ...... جب آگئے تو سوچتے کیا ہو...... چنتا کی کوئی بات نہیں ہے، ہم لوگ ہیں نا......"

راجیش اب مسجد کے احاطے میں تھا۔ سامنے امام صاحب کا کمرہ تھا۔ راجیش ہی نے دروازے پر دستک دی۔ امام صاحب نے دروازہ کھولا تینوں کو دیکھ کر امام صاحب نے کچھ سوچنے کی طرح منہ بنایا۔ ان کے ذہن پر رضوان اور ظفر کی تصویر ابھری اور دن میں کیے گئے سوال وجواب کا سلسلہ یاد آگیا۔ راجیش کو امام صاحب خوب پہنچانتے تھے۔ وہ بارہ برسوں سے امامت کررہے تھے۔ دوسرے یہ کہ جہاں راجیش کی دکان مینابازار میں تھی اس کے پاس عبدالشکور صاحب کی دکان بھی تھی۔ عبدالشکور صاحب امام صاحب کے گاؤں کے تھے۔ دونوں اس شہر میں ایک ساتھ ہی آئے تھے۔ عبدالشکور صاحب نے تجارت کو اپنایا اور امام صاحب نے مسجد کو اکتساب معاش کا ذریعہ بنایا۔ دونوں ہی گہرے دوست تھے۔ امام صاحب اکثر مغرب کے بعد ایک گھنٹے عبدالشکور صاحب کی دکان پر پابندی سے بیٹھا کرتے تھے۔

اس ماحول میں راجیش کو دیکھ کر امام صاحب ذرا چکرائے۔ امام صاحب نے پس وپیش کے عالم میں کہا......

"آیئے اندر آیئے آپ لوگ"!

راجیش نے کہا......

"اچھا امام صاحب اہم چلتے ہیں آپ لوگ بات کیجیے"

امام صاحب بہت ڈرپوک تھے۔ انھوں نے سوچا اچھا ہے راجیش چلا جائے ورنہ اب نماز کا وقت ہونے والا ہے، لوگوں نے دیکھ لیا تو خواہ مخواہ وہ بھی مشکوک ہوجائیں گے ...... مگر امام صاحب کے کچھ کہنے سے پہلے رضوان نے کہا......

"راجیش تمہیں کتنی جلدی ہے۔ اب تو اذان ہوگی، نماز

پڑھ کر چلیں گے۔ تم اسی کمرے میں آرام سے بیٹھے رہنا۔ کیوں امام صاحب!"

آں ہاں ہاں...... آں آں ہاں آں...... کیوں نہیں، آپ بس یہیں، ہاں یہیں رکیے ...... بس اذاں ہو گی پھر نماز ہو گی...... معاف کیجیے وقت ہو گیا ہے، آج کل موذن بھاگا ہوا ہے اذاں مجھے ہی دینا ہے"۔

رضوان نے کہا...... "امام صاحب اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ظفر سے اذاں کہلوا دیتے ہیں...... بہت پرسوز آواز ہے، پھر یہ کہ دن میں جو سوال جواب ہوا تھا، اس کی ایک کڑی یہ بھی سہی"۔

امام صاحب جز بز ہو کر رہ گئے۔

"ہاں ہاں شوق سے ......"

امام صاحب نے مائک درست کیا۔ ظفر نے اپنی دل کش آواز میں اذاں کہی مگر اس سے پہلے وہ بیسیوں بار کھنکھارتا رہا جو اس کی متعدی بیماری تھی۔

نماز کے بعد تینوں امام صاحب کے کمرے میں جمع ہوئے۔ راجیش تو امام صاحب کے کمرے میں موجود تھا ہی۔ دوران گفتگو رضوان نے اس بات کی وضاحت کی ......

"راجیش میرا جگری دوست ہے اس کی ہی خیرت لینے آیا تھا۔ ہو سکتا ہے آپ کو یہ بات بری معلوم ہو کہ یہاں مسلمانوں کی خیرت لینے والا کوئی نہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے تو سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔ ملّی فریضہ ایک الگ معاملہ ہے مگر ذرا سوچیے کہ ایک

ہندو دوست جو مجھے نماز پڑھنے کی یاد دلاتا رہا ہو، اس
کا کچھ حق مجھ پر ہے کہ نہیں"۔
امام صاحب کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ رضوان نے اپنی بات
جاری رکھی......
"امام صاحب اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہاں کے دو
چند بارسوخ مسلمانوں سے ہمیں ملوائیے اور آپ بھی
محنت کیجیے تاکہ یہ زہر آلود ماحول ذرا بدلے۔ راجیش اور
اس کے پتا بھی کچھ ہندوؤں سے بات چیت کریں گے"۔
امام صاحب کو لگا کہ آخر یہ سب ممکن کیسے ہو سکتا ہے۔ دونوں
فرقوں میں غم وغصے کی لہر اتنی تیز ہے کہ ابھی کچھ بھی ممکن نہیں۔ امام
صاحب نے کہا......
"اب تو اتنا وقت بھی نہیں ہے کہ لوگوں سے ملاقات
ہو سکے، سات بجنے کے بعد پھر کرفیو لگ جائے گا"
"وہ تو خیر ٹھیک ہے مگر سات بجنے میں ابھی ایک گھنٹہ
باقی ہے۔ کم سے کم ایک دو لوگوں سے تو مل ہی سکتے
ہیں"۔
اس بار ظفر نے یہ تجویز رکھی تھی۔ امام صاحب نے اس بار اپنی
مجبوری ظاہر کی......
"دراصل ابھی مجھے ایک صاحب کے گھر ٹیوشن پڑھانے
جانا ہے، دو روز سے ناغہ ہو رہا ہے"۔
رضوان نے سمجھ لیا کہ امام صاحب بہت آسانی سے راستے پر
آنے والے نہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ حضرت لکیر کے فقیر اور "میاں کی

دوڑ مسجد تک" کے مصداق زندگی گزارنے والے ہیں۔ سماجی اور ملکی مسائل سے بھلا انھیں کیا لینا دینا۔ ایسے ہی لوگ مسجد کے منبر سے موٹی موٹی لچھے دار تقریریں کر کے عوام کو ورغلاتے ہیں اور خود حجرہ نشیں رہتے ہیں۔ بلکہ خود حجرہ، ٹیوشن، نیل دی ہوئی قمیص، اذان، خطبہ، مکتب میں بچوں کے کان اینٹھنے اور جمعراتی وصول کرنے سے آگے کچھ نہیں سوچتے۔ ان حجرہ نشیں مولویوں اور اماموں کو بوسنیا اور چیچینا کے مسلمانوں سے کیا مطلب؟ رضوان کے ذہن پر بس ایک لمحے میں سب کچھ ابھرا اور مٹ گیا۔

"اچھا تو یہ ہے آپ کی مجبوری!" تو پھر کون سا وقت مناسب ہوگا؟ آپ ہی بتایئے۔"

"فجر کی نماز میں آپ لوگ آیئے۔ طے کرلیں گے کہ کیسے کیا کرنا ہے؟"

"کرفیو میں کیسے آسکتے ہیں؟ کرفیو تو سات بجے صبح کے بعد ہی ختم ہوگا"

ظفر نے وضاحت کی اور ساتھ ہی تجویز بھی رکھی۔......

"ایسا کیجیے امام صاحب، آپ ہی راجیش کے گھر پر آجایئے!"

راجیش نے بھی حامی بھری......

"ہاں امام صاحب آپ ہی ہمارے گھر آیئے۔ ہمارے لیے تو یہ سوبھاگیہ کی بات ہوگی"۔

امام صاحب کے پسینہ چھوٹ گیا۔ انھوں نے جان چھڑانے کی غرض سے نئی راہ نکالی......

"آپ لوگ ہی سات بجے صبح آجایئے، یہیں سے چل کر

کچھ لوگوں سے ملاقات کریں گے۔"

رضوان سمجھ گیا کہ یہ امام صاحب کتنے پانی میں ہیں۔ وہاں سے جب تینوں چلنے کو تیار ہوئے تو امام صاحب نے رسمی طور پر کہا......

"بیٹھیے چائے بناتا ہوں۔ پی کر جایئے!"

ظفر نے چٹکی لی......

"ہاں چائے پینے کی خواہش تو تھی مگر آپ کو تو ٹیوشن جانا ہے۔ لیکن آپ ضد کرتے ہیں تو پانچ منٹ اور سہی......!"

رضوان نے اگر ظفر کا ہاتھ پکڑ نہ لیا ہوتا تو وہ بیٹھنے کو تقریباً جھک گیا تھا۔

تینوں وہاں سے نکل پڑے۔ آس پاس کے کچھ لوگوں نے تینوں کو نکلتے دیکھا۔ راجیش کو دیکھ کر تعجب بھی ہوا کہ مسجد کے احاطے میں وہ کیا کرنے گیا تھا۔ دن میں ہوئے سوال وجواب سے رضوان اور ظفر کو وہاں کے کئی لوگوں نے پہچان لیا تھا۔ جب یہ لوگ راجیش کے گھر پہنچ گئے تو راجیش کو بھی اطمینان ہوا اور ادھر امام صاحب بھی سمجھے کہ آفت ٹلی۔ وہ جلدی سے پائجامہ پہن کر ٹیوشن کے لیے نکل پڑے۔ یہ بھی ایک طریقہ ہے زندگی گزارنے کا۔

۱۷
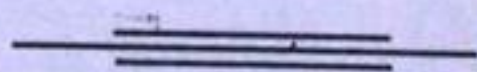
کھانے کے بعد سب ایک ساتھ بیٹھے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ ایک بائیس سالہ نوجوان راجیش کو بلانے آیا۔ وید ناتھ جی نے کہا......

"کیا بات ہے شنکر؟"

"راجیش بھیا کو بلانے آئے ہیں"۔

"اس وقت! کہاں جانا ہے"؟

اس لڑکے نے بتایا کہ یہیں ساگر بابو کے گھر پر جانا ہے۔ ساگر بابو ایک ریٹائرڈ فوجی تھے۔ ان کی دھاک بھی تھی۔ حالاں کہ وید ناتھ جی ان کے نظریے سے اتفاق نہیں کرتے تھے ۔ ہو سکتا تھا کہ وہ راجیش کو جانے سے منع کر دیتے مگر شاید کسی وجہ سے یا ہو سکتا ہے رضوان اور ظفر کی موجودگی میں کسی طرح کی سخت کلامی کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتے ہوں۔کیوں کہ وہ رکھ رکھاؤ والے آدمی تھے۔ راجیش وہاں سے اٹھ کر ساگر بابو کے گھر چلا گیا۔ اجے بابو کے گھر کے بعد ہی ساگر بابو کا گھر تھا۔ وہاں پہلے ہی سے دس بارہ لوگ موجود تھے۔ راجیش جب وہاں بیٹھ گیا تو ساگر بابو نے سوال کیا......

"راجیش! یہ دو مسلمان لڑکے تمہارے پاس کس لیے

آئے ہیں؟"

"انکل! وہ میرے دوست ہیں۔ ایسے ہی آگئے ہیں۔"

"مگر ہمیں تو معلوم ہوا کہ وہ کچھ ہندو مسلم ایکتا کی بات کرتا ہے۔ جنگی مسجد کے امام سے ملنے ان کے ساتھ تم بھی تو گئے تھے؟"

راجیش نے کھلے طور پر جواب دیا............

"انکل ان لوگوں کو جو کرنا ہے کرنے دیجیے، ہمیں تو وہی کرنا ہے جو آپ نے سمجھایا ہے۔ ہم اتنے بڑے مُرکھ نہیں ہیں انکل !"

ساگر بابو نے خوش ہو کر شاباشی دی اور آگاہ بھی کیا......

"شاباش بیٹے شاباش! تمہارے جیسے نوجوانوں کی آوشیکتا ہے اس دیش کو...... امیش کو بھی سمجھا دینا اور سب پر نظر رکھنا۔ ہم فوجی لوگ آسانی سے کسی پر بھروسہ نہیں کرتے۔ ہمیں اپنے اوپر والوں کو جواب بھی دینا ہے...... ٹھیک ہے راجیش تم جا سکتے ہو۔"

راجیش نے حامی بھری اور پرنام کرتا ہوا وہاں سے آگیا۔

رضوان اور راجیش کے والد ویدناتھ جی دیر رات تک باتیں کرتے رہے۔ رضوان نے بتایا کہ اگر وہ کچھ با رسوخ اور سمجھ بوجھ رکھنے والے ہندوؤں سے مل کر کشیدہ ماحول کو کم کرنے کی کوشش کریں تو یہ ایک بڑا کام ہوگا۔ اس نے بتایا کہ کل صبح جنگی مسجد کے امام صاحب کے ساتھ وہ بھی دو چند با اثر مسلمانوں سے اس سلسلے میں ملاقات کرے گا۔ اس تجویز سے ویدناتھ جی بہت خوش ہوئے۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ اس زہر آلود فضا

میں صاف ستھری ہوا آئے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر کوشش نہ کی گئی تو سرکار کرفیو نافذ کرتی رہے گی اور مفت میں عوام کو کٹھنائیوں کا سامنا کرتے رہنا پڑے گا۔ پھر یہ کہ مسجد اجاڑی جائے یا مندر توڑا جائے، ایک عبادت گاہ ہی تباہ ہوتی ہے۔ کاش! اس دیش کے لوگوں کو اپنے اپنے دھرم سے محبت ہوتی۔ افسوس ہوتا ہے کہ اپنے دھرم پر تو چلا نہیں جاتا البتہ دوسرے دھرم پر نکتہ چینی کرنا بڑا اچھا لگتا ہے۔

ہندو ہو یا مسلمان نوے فی صد ایسے لوگ ہیں جو اپنے دھرم سے دور ہیں مگر دوسرے دھرم کو گالیاں ضرور دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپس میں نفرت پنپتی ہے اور فساد کی بنیاد کھڑی ہوتی ہے۔...... مگر صرف ویدناتھ جی کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے! زہر جو خون میں سرایت کر چکا ہے اس کا کیا علاج ہے۔ کیا سائنس نے ایسا کوئی طریقہ ایجاد کیا ہے جس سے خون میں ملے ہوئے زہر کو بھی نکال دیا جائے۔ یہ زہر تو وائرس کی طرح بلوٹنگ پیپر سے بھی چھن کر باہر آجاتا ہے۔ شاید خون بدلنے پر یہ زہر خون کی نلی کی دیوار سے چپک جاتا ہے جیسے جونک چپک جاتی ہے کسی خشک زمین پر اور پانی ملتے ہی دوبارہ چلنے پھرنے لگتی ہے...... کچھ دیر کے بعد ویدناتھ جی بھی سونے کے لیے چل پڑے......

"اچھا بیٹے آرام کرو، سویرے بات کریں گے۔"

"جی انکل!"

رضوان کو نیند نہیں آرہی تھی۔ وہاں ایک رسالہ مایا پڑا ہوا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں رضوان اس کے اوراق الٹ پلٹ کرنے لگا۔

ظفر کے پاس جاکر اس نے بھی سونے کی کوشش کی۔ ظفر کروٹ بدل کر خراٹے لینے لگا۔ رضوان سمجھ گیا کہ آج پوری رات جاگنا پڑے گا۔

اس نے سوچا کیوں نہ کچھ نفلیں پڑھ لی جائیں۔ وضو کرکے اس نے نفل شروع کردی ۔ رات کے دو بج چکے تھے ۔ ظفر کی آنکھ کھلی تو رضوان کو نماز پڑھتے دیکھ کر اسے تعجب ہوا۔ اس نے سرگوشی میں کہا......

"سالا چرا چرا کے عبادت کرتا ہے"۔

پھر وہ باہر پیشاب کرنے چلا گیا جب تک رضوان نے نفل پوری کرلی۔ ظفر نے آکر سوال کیا۔

"کیوں تم سوئے نہیں؟"

"نہیں، نیند نہیں آرہی ہے، بہت کوشش کی۔ اس خالی وقت میں سوچا کیوں نہ چار رکعت نفل ہی پڑھ لوں۔"

ظفر پر نیند کا غلبہ تھا، وہ بستر پر چلا گیا۔ رضوان جب دعا کو ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا، ظفر نے خرّاٹے لینے شروع کردیے۔ یہ بھی نصیب کی بات ہوتی ہے۔ نیند بھی کیا نعمت ہے۔ ظفر سو رہا تھا اور رضوان بے چین سا جاگ رہا تھا۔ اس تنہائی میں اسے ایک بہت ہی پرانا واقعہ یاد آگیا۔ وہ چودہ برس کا رہا ہوگا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ وہ کھانا کھا رہا تھا کہ ندی کی طرف سے شور اٹھا۔ گاؤں سے لوگ لاٹھی بھالا، برچھی، کٹار لے کر ندی کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اس نے بھی کھانا چھوڑدیا۔ گھر کے کونے میں رکھی لاٹھی لے کر دھوپ میں سوکھے اور سخت ڈھیلوں بھرے کھیتوں سے دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا جہاں چار پانچ سو آدمیوں کا مجمع تھا۔ لوگ اب بھی گاؤں سے ادھر ہی بھاگے آرہے تھے۔ دو تین بندوق والے اپنی بندوقیں بھی لے آئے تھے۔ وہاں عجیب عجیب طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ گاؤں کی عورتیں گھڑوں اور بالٹیوں میں پانی بھر لائی تھیں۔ وہ گاؤں کے مجاہدوں کو محاذ جنگ پر پانی پلا کر میدان کربلا کا نقشہ پیش کرنا چاہتی تھیں۔ ان کے

ہونٹوں پر اپنی جیت کے لیے دعائیں مچل رہی تھیں۔ یہ منظر رضوان کے لیے ایک دل چسپ تجربہ پیش کرتا تھا۔ مگراب اس نے اس پرانے منظر میں بہت کچھ تلاش کرلیا تھا۔

ندی میں پانی کم تھا اور مچھیروں نے جال ڈال کر مچھلیاں نکالی تھیں۔ مشرقی محلے کے دو تین نوجوانوں نے اپنے حصے کی مچھلی مانگی تھی۔ ندی کے اس پار پچکھی گاؤں تھا جہاں کا سونوا ڈاکو مشہور تھا، جس سے تُو تُو مَیں مَیں ہو گئی تھی۔ اس نے نوجوانوں کو ڈرایا دھمکایا تھا۔ سونوا ڈاکو نے مچھلی اور جال کو اپنے قبضے میں کرلیا تھا۔ مچھیرے بے چارے خاموش تھے۔ نوجوانوں نے شور مچادیا تھا جس کے سبب اتنے لوگ جمع ہوگئے تھے۔ جہاں یہ لوگ جمع ہوئے تھے وہاں شیشم، بانس اور آم کے درخت تھے۔ ندی کی طرف بڑھتے ہی کیلے کے درختوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا تھا جو ساحل دریا تک پہنچتا تھا۔ یہاں سے تھوڑی دور جنوب میں رضوان کے بھی کیلے اور امرود کے باغ تھے جہاں وہ بچپن میں دن دن بھر ان کی رکھوالی کیا کرتا تھا۔ اب سب ندی نے کاٹ لیا تھا۔ نہ کیلے تھے اور نہ امرود۔

وہاں جمع ہوئے لوگوں میں مشورہ ہورہا تھا کہ کس حکمت عملی کے تحت جال اور مچھلی کو اپنے قبضے میں کیا جائے۔ ندی اس پار سونوا ڈاکو اپنی بندوق تانے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے جانے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ ادھر بھی بندوق والے تھے۔ مگر سب بڑی بڑی باتیں بنارہے تھے۔ شاید ان کی بندوقیں خالی رہی ہوں گی۔ یا پھر کارتوس خرچ کرکے خود پر کسی طرح کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ بندوق اور کارتوس کے لیے گاؤں والے چندہ تو نہیں کریں گے۔ پھر کیا ضروری ہے کہ کارتوس کا استعمال کیا جائے۔ یہی کیا کم تھا کہ گاؤں کی حفاظت کے لیے یہ لوگ اپنی بندوقیں لے آئے تھے۔

ادھر ایک طرف ہزاروں مسلمان اور دوسری طرف ایک سونوا ڈاکو۔
رضوان نے تاریخ اسلام میں پڑھا تھا اور پھر کسی مولانا کی تقریر میں بھی سنا تھا کہ جنگ بدر کے موقع پر صرف تین سو تیرہ مسلمانوں نے ہزاروں کفار مکّہ کا مقابلہ کیا تھا اور فتح حاصل ہوئی تھی۔ مولانا نے اپنی تقریر میں علامہ اقبال کا یہ شعر بھی پڑھا تھا

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

جب کوئی واضح حکمت عملی سمجھ میں نہیں آئی تو دو لوگوں نے ندی میں اترنے کا ارادہ کیا۔ مولانا محمد نورالحق اور وجیہ الحق۔ مولانا نورالحق خاموش طبیعت کے انسان تھے، کم سخن و کم آمیز۔ گاؤں میں نماز جمعہ اور عیدین وہی پڑھایا کرتے تھے۔ رضوان نے سنا تھا کہ وہ علم منطق کے ماہر ہیں۔ اس کے علاوہ دور دور سے لوگ ان سے ترکہ نکلوانے آیا کرتے تھے۔ اسلام نے جو طریقہ بتایا ہے اس کے مطابق زمین جائداد کا حصہ بخرہ ہر عالم دین کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ طریقہ فقہ اسلامی کا ایک فن ہے جس کا رشتہ علم ریاضی سے بھی ہوتا ہے۔ اس طریقے کو مناسخہ سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

دوسری طرف وجیہ الحق جو جاہل اور ایک نمبر کا پیکٹر تھا۔

گاؤں کے لوگ وجیہ الحق کو "وجہیل" سے پکارا کرتے تھے۔ اکثر وہ کسمھوایا پھلوریا بازار کے تاڑی خانے سے تاڑی پی کر مستی کے عالم میں جھومتا ہوا گھر آتا۔ آدمی جب نشے کے عالم میں ہوتا ہے تو غضب کی فلسفیانہ گفتگو کرتا ہے۔ شاید ایک شرابی اور نشے باز کو ملت کا درد زیادہ ہوتا ہے۔ نشّے کی حالت میں اس کی عقل آرام کرتی ہے اور صرف جذبات ہوتے ہیں

جن پر کسی قسم کی پہرہ داری نہیں ہوتی۔

یکبارگی شور سا ہوا کہ مولانا نورالحق اور وجھیل ندی میں اتر کر اس پار جارہے ہیں۔ خالی ہاتھ...... ہاتھ میں ایک ڈنڈا تک نہیں کہ کم از کم ندی کی گہرائی کا اندازہ بھی ہوسکے۔ آدھے سے زیادہ لوگ اب ندی کی طرف لپکے۔ کچھ لوگ چھوٹے لڑکوں کو منع کرنے اور بھگانے میں لگے تھے۔ کئی بچوں کو طمانچے بھی کھانے پڑے۔ ایک افراتفری کا ماحول پیدا ہوگیا۔ عورتیں جو محاذ جنگ پر پانی پلانے آئی ہوئی تھیں، ان کے ہونٹوں پر بہ آواز بلند دعائیں تیز ہوگئیں۔ دونوں جب پانی میں چھپ چھپ کرتے اس پار جارہے تھے تو سونوا ڈاکو نے اپنی بندوق سنبھالتے ہوئے کہا تھا۔

"رک جاؤ...... میں کہتا ہوں رک جاؤ!"

دونوں بڑھتے جارہے تھے۔ شاید دونوں شہید ہونے کو تیار تھے۔ سونوا ڈاکو اب پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا۔ مولانا نورالحق نے بھانپ لیا کہ اس کی بندوق خالی ہے ورنہ وہ کب کا فائر کرچکا ہوتا۔ اس نے تو سیکڑوں کی جانیں لی تھیں۔ راتوں کی سیاہی میں عورتوں کی عصمت دری کرنا، مال لوٹنا اور مزاحمت ہونے پر لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا سونوا ڈاکو کا تو پرانا پیشہ تھا۔ مولانا نورالحق نے اپنے گاؤں والوں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا......

"اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ سب جھوٹ موٹ کا دکھاوا ہے"۔

یہ سن کر دس بیس اور لوگ ندی میں اتر گئے۔ پھر تو دیکھتے ہیں دیکھتے مچھلیوں سے بھرا جال اپنے قبضے میں تھا۔ مچھیروں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ خاموش کھڑے رہے۔ لوگوں کو ندی میں اترتے دیکھ کر سونوا

ڈاکو اس تیزی سے بھاگا جیسے اس کے پیچھے کسی نے کٹاہا کتا چھوڑ دیا ہو......
لیکن اس خالی بندوق کی حقیقت کھلنے میں دو گھنٹے کا وقفہ گزر گیا۔ اگر مولانا نورالحق اور وجیہ الحق ہمت سے کام لے کر ندی میں اترے نہ ہوتے تو اور بھی وقت گزر سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ مچھلی اور جال سے ہاتھ بھی دھونا پڑتا۔ پھر تو ہمیشہ کے لیے گاؤں والوں کو اپنے ہارنے کا احساس ستاتا رہتا۔ تھوڑی دیر کے لیے سوچیے کہ اگر سونوا ڈاکو کے پاس بھری بندوق ہوتی اور وہ فائر کر دیتا تو کیا ندی کا پانی لال نہ ہو جاتا...... پھر تو یہ ندی ایک زمانے تک لال رہتی اور یہاں کی مچھلیاں مارے حیرت کے ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر اپنے سر پھوڑ لیتیں اور لال پانی اور بھی لال ہو جاتا...... گویا یہاں ایک بڑا فساد برپا ہوتا جو شاید بھاگل پور، مراد آباد، بھیونڈی، میرٹھ، جمشید پور اور سیتا مڑھی کے فسادات سے کسی طرح بھی کم نہ ہوتا...... اس طرح خیالات کی ادھیڑ بن میں وقت گزر گیا۔

فجر کی اذان ہوئی جس سے فضاؤں کا سکوت ٹوٹا۔ اذاں کیا تھی جیسے ایک سہمی ہوئی شکوہ سنج آواز۔ ظفر کی آنکھ کھل گئی۔ پکا نمازی تھا۔ جب وہ آرکسٹرا کا اسٹیج پروگرام کرتا تو اس ماحول میں بھی تھوڑی دیر کے لیے غائب ہو کر کہیں سے نماز پڑھ کر آجاتا۔ گویا نماز اس کے سانسوں میں شامل تھی۔ ظفر نے کروٹ بدلی اور پھر توبہ توبہ کرتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ رضوان کو بیٹھا دیکھ کر اس نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا............

"سوئے نہیں ہو کیا"؟

"نہ یار، نیند بالکل نہیں آئی"۔

"ہو سکتا ہے جگہ اور بستر بدل جانے سے نیند نہ آئی ہو"۔

"مگر تم تو خوب سوئے ہو...... جگہ تو تمہارے لیے بھی نئی تھی۔"

"مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تو کسی بھی ماحول میں سوجاتا ہوں۔ چلو دن میں سو لینا۔ وضو کرلو، یہیں جماعت کرلیتے ہیں"۔

"تم وضو کرلو، میرا وضو ہے!"

ظفر وضو کرکے آیا اور دونوں نے فجر کی نماز پڑھی۔ تھوڑی دیر میں راجیش کے والد ویدناتھ جی آگئے۔

"اچھا بیٹے تم لوگ جاگ چکے ہو۔ میں نے سوچا کہ شاید آنکھ نہ کھلی ہو۔ برسوں سے میں بھی اذاں سن کر اٹھ جاتا ہوں اور تھوڑا بہت گیتا کا پاٹھ کرلیتا ہوں......"

ظفر نے بتایا کہ رضوان پوری رات جاگتا رہا ہے۔ ویدناتھ جی نے حیرت سے پوچھا......

"کیوں بیٹے! کیا بات ہے۔ چوکی میں کھٹمل ہے کیا؟"

"نہیں انکل!"

"پھر......؟"

"بس یونہی!"

اس کا مطلب ہے تم کچھ سوچ رہے تھے۔ دیکھو بیٹے بہت سوچ سوچ کر اپنی حالت کیوں بگاڑتے ہو۔ اس دلیش کو تو جہنم میں جانا ہے، جائے گا۔ مرزا غالب کا ایک شعر یاد آرہا ہے ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

وہ تو ٹھیک ہے انکل مگر اس دور میں انسانیت نام کی چیز نہیں۔غالب نے اس شعر میں کتنی اچھی بات کہی ہے ؂

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

"غالب کا بھی جواب نہیں بیٹے، میں نے تو بی اے میں ایک اردو پرچہ بھی لیا تھا۔ غالب میں خوب دل چسپی تھی۔ اب تو کم شعر یاد رہ گئے ہیں ورنہ غالب کے تین سو اشعار زبانی یاد تھے...... خیر چھوڑو ان باتوں کو منہ ہاتھ دھولو، میں چائے بھیج دیتا ہوں۔ راجیش کو بھی جگا دیتا ہوں"۔

رضوان اور ظفر نے منہ ہاتھ دھوئے جب تک راجیش بسکٹ چائے لے کر آگیا۔چائے لینے کے بعد رضوان نے کہا۔

"وقت ہو گیا ہے امام صاحب سے ملنے کا۔ اب چلتے ہیں راجیش"۔

راجیش نے اس بار معذرت چاہی......

"ایسا ہے، اب تو تم دونوں نے سب کچھ دیکھ ہی لیا ہے، مجھے چھوڑ دو میں نستہ پانی کا اِنجام (انتظام) کرتا ہوں۔تم لوگ نو بجے تک واپس آجانا۔"

لیکن رضوان بضد تھا......

"تم بھی چلتے تو اچھا تھا، اب تو بہت کچھ نارمل ہے۔"

"نہیں نہیں، میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا" راجیش نے خود کو بچانے کے لیے کہا۔اس بار ظفر نے بھی راجیش کی طرفداری کی......

”رضوان ذرا سمجھا کرو۔ کیا ضروری ہے کہ ہر بار راجیش
کو پریشان کیا جائے...... چلو ہم دونوں چلتے ہیں“۔

رضوان نے بھی خلاف عادت اس بار ضد نہیں کی اور چلنے کو تیار ہو گیا...... ”اچھا چلو“

رضوان اور ظفر جب جنگی مسجد کے احاطے میں داخل ہوئے تو وہاں کچھ بھیڑ نظر آئی۔ امام صاحب کے کمرے میں کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں کچھ تلخ و تند باتیں ہو رہی تھیں۔ امام صاحب کے کمرے کے پاس آکر رضوان نے سلام کیا...... ”السلام علیکم“

”وعلیکم السلام“

ایک ساتھ کئی لوگوں نے جواب دیے۔

امام صاحب نے رضوان اور ظفر کو دیکھتے ہی کہا......

”کل مغرب کے وقت یہی دونوں تو آئے تھے۔ راجیش
بھی ان کے ساتھ ہی تھا“۔

رضوان کی سمجھ میں بہت جلد آگیا کہ کل یہاں سے جانے کے بعد ضرور مرچ مسالہ لگا کر یہاں افواہ پھیلائی گئی ہے۔ امام صاحب کے کمرے میں جگہ کم تھی اس لیے دونوں باہر دروازے پر کھڑے رہے۔ کچھ دیر کے بعد ایک بوڑھے آدمی نے کہا......

”ارے ان لوگوں کو بھی بیٹھنے کی جگہ دو یا پھر باہر انگنائی
میں چلو“۔

”ہاں ہاں باہر چلیے“ کئی لوگوں نے کہا اور پھر سب کے سب اٹھ کر باہر آگئے۔ رضوان اور ظفر بھی ساتھ ساتھ بٹھائے گئے۔ وہاں امام صاحب سے مواخذہ ہو رہا تھا کہ ہندو مسلم یکجہتی کے بہانے کہیں ہندوؤں کی

مدد تو نہیں کی جارہی ہے۔ شبہ اس لیے پیدا ہوا تھا کہ راجیش دو اجنبی مسلم نوجوانوں کے ساتھ مسجد میں کیوں آیا تھا اور گھنٹے بھر امام صاحب کے کمرے میں بیٹھا کیا کرتا رہا۔ ایک ۴۵ سالہ شخص نے سوال کیا......

"ہاں صاحب! آپ دونوں یہاں کس مقصد سے آئے ہیں؟"

رضوان نے بہت سنبھل کر جواب دیا......

"دیکھیے ہمارا کوئی منصوبہ بند مقصد تو نہیں تھا مگر یہاں آکر سوچا کہ کیوں نہ بگڑی ہوئی فضا کو ساز گار بنانے کی کوشش کی جائے۔"

"اگر ایسا ہی تھا تو آپ دونوں کو ایک ہندو کے گھر قیام کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"آپ مسجد میں رک جاتے یا پھر ہمارے گھر آجاتے۔"

رضوان نے جرأت مندی کے ساتھ صفائی پیش کی......

"دراصل راجیش ہمارا جگری دوست ہے۔ ہمیں اس پر اور اس کے گھر والوں پر پورا بھروسہ ہے۔ ہم اسی کی خیریت لینے تو آئے تھے......"

"یعنی آپ کو مسلمانوں کے نقصان سے کچھ لینا دینا نہیں!"

"بڑے حسب خواہ ہیں آپ ہندوؤں کے!"

"کبھی خود پر پڑے تب تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو۔"

رضوان اور ظفر اس وقت طرح طرح کے مکالموں کے نرغے میں تھے۔ ظفر نے سمجھ لیا کہ بس تھوڑی ہی دیر میں دونوں کی مرمّت ہونے والی ہے۔ اس نے سوچا کہ اچھا ہوا کہ راجیش نہیں آیا ورنہ اور بھی

بات کا بتنگڑ بن جاتا۔ رضوان پر اسے غصّہ بھی آرہا تھا کہ سالا پوری دنیا کو سدھارنے کے چکّر میں ہمیں بھی پٹوا کر رہے گا...... مگر رضوان نے خود اعتمادی کے ساتھ گفتگو جاری رکھی......

"میں صفائی تو خیر نہیں دے سکتا کہ مجھے بھی اپنی قوم سے بہت ہمدردی ہے۔ مسلمانوں کے نقصان کا مجھے خوب علم ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ کیا صرف ردعمل اور جوابی کارروائی سے ہم اپنی ملت کو بچا سکتے ہیں؟ کیا غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنے کی اخلاقی جرأت ہم میں ہے؟"

رضوان کی باتوں سے کچھ لوگ متاثر ہوئے اور کچھ لوگ ردعمل میں بھڑک اٹھے۔ ایک نوجوان قسم کے مولوی صاحب نے کہا......

"دیکھیے چکنی چپڑی باتوں سے ہمیں بیوقوف نہ بنایئے۔"

رضوان سے رہا نہ گیا...... اسے نمائشی مولوی سے ہمیشہ چڑ سی رہی تھی۔ اس نے بھی اس مولوی کو سمجھانے کی کوشش کی......

"اچھا مولانا! قرآن میں فساد برپا کرنے سے جہاں جہاں منع کیا گیا ہے وہاں وہاں کیا بصرف کافر کو ہی خطاب کیا گیا ہے؟ میں کوئی عالم دین تو نہیں مگر چار آیتیں مجھے یاد آرہی ہیں..........

"سورہ قصص کی آیت ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ
سورہ بقرہ کی دو آیتیں ہیں۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ
لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ
اسی طرح سورہ اعراف کی یہ آیت : لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ،ان آیتوں کا پس منظر کیا ہے۔ کیا مسلمانوں میں جو لوگ فساد برپا کرنے والے ہیں، ان پر ان آیتوں

کا اطلاق نہیں ہوتا۔ پاکستان میں مسلمان ہی مسلمان کو
قتل کر رہے ہیں، وہ بھی مسجدوں میں گھس کر...... کیا یہ
فساد نہیں ہے؟ فساد تو بگاڑ کو کہتے ہیں، خواہ کوئی بھی اس
کا ارتکاب کرے۔"

رضوان کی باتوں سے سب پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اس نے اپنی
بات جاری رکھی۔

"ہمارے نزدیک انسانیت کا پیغام اہم ہے۔ ہندوؤں نے
اگر بابری مسجد ڈھادی ہے تو کیا مجھے دکھ نہیں ہے؟ مگر
کیا ردعمل میں ہی اپنی قوت خرچ کر دینا عقل مندی
ہے؟ یہ نہ بھولیے کہ ہمارے مسلم رہنماؤں نے ہی اشتعال
انگیزی کر کے ہندوؤں کو متحد کیا ہے۔ ادھر بابری مسجد
گری اور یہ نام نہاد مسلم رہنما اپنی اپنی کٹیا میں گھس
گئے............"

رضوان کی اس مختصر سی تقریر نے جیسے سب کی آنکھیں کھول
دیں۔ امام صاحب جو منہ لٹکائے بیٹھے تھے، ان کے چہرے پر تازگی لوٹ
آئی۔ ایک بڑے بزرگ نے شفقت کے انداز میں کہا......

"ٹھیک ہے، بتایئے آپ لوگ کیسے کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہم چاہتے ہیں کہ آپ لوگوں میں سے کچھ لوگ ایک
ساتھ جمع ہوں اور اُدھر وید ناتھ جی کچھ ہندوؤں کو جمع
کریں، پھر دونوں فرقوں کے لوگ مل جل کر امن اور
سکون کا ماحول بنانے کی کوشش کریں۔ انشاء اللہ اچھا
نتیجہ نکل کر سامنے آئے گا۔ سوچیے تو سہی کہ ہمارے

آپ کے لیے یہ ماحول کتنا اذیت ناک ہے "!

ایسا لگا جیسے رضوان کی باتوں نے جادو کا سا اثر دکھایا۔ وہاں سے لوگ منتشر ہونے لگے۔ دو تین بڑے بزرگوں نے رضوان اور ظفر کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ راستے میں باتیں کرتے جارہے تھے۔ مشورہ یہ ہوا کہ "شانتی سبھا" کے لیے ضلع مجسٹریٹ سے اجازت لینی بھی ضروری ہے۔ رضوان نے کہا کہ جہاں مناسب سمجھیں وہاں ہم سب جمع ہو جائیں، وہیں سے ضلع مجسٹریٹ سے ملاقات کے لیے چلیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔

"کیوں نہ ابھی چلیں"! ایک بڑے بزرگ نے کہا۔

رضوان نے سمجھاتے ہوئے کہا......

"بہتر ہوگا کہ دس بجے کے بعد چلیں۔ ہم لوگ راجیش کے والد اور دو چند ہندوؤں کو بھی لے کر آتے ہیں۔ دونوں فرقوں کی طرف سے نمائندگی ہوگی تو ضلع مجسٹریٹ کو اجازت دینے میں کسی طرح کا تامل نہیں ہوگا۔"

سبھوں نے سمجھ لیا کہ رضوان کی بات اور حکمت عملی مناسب حال اور معقول ہے۔ لہٰذا یہ طے ہوا کہ حاجی سلیمان کی کوٹھی پر ساڑھے دس بجے سب لوگ جمع ہوں گے۔ حاجی صاحب پرانے وضع دار اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ چمڑے کا اچھا کاروبار تھا۔ ان کی کئی کوٹھیاں تھیں۔ شہر کے لوگ ان کی عزت کیا کرتے تھے۔ ہندو بھی ان کا سمان کیا کرتے تھے۔ غریبوں کے تو وہ مسیحا تھے۔

رضوان اور ظفر راجیش کے گھر آئے تو وہاں شدت سے انتظار ہو رہا تھا کیوں کہ ساڑھے نو بج چکے تھے۔ آتے ہی ویدناتھ جی نے سوال کیا۔

"بہت دیر ہو گئی بیٹے؟"

"ہاں انکل، یہ طے ہوا ہے کہ حاجی سلیمان کی کوٹھی پر ساڑھے دس بجے بیٹھک ہوگی۔ وہاں آپ بھی چلیں گے اور دو چند اور بھی جن کو آپ مناسب سمجھتے ہوں، اپنے ساتھ لے کر چلیں"۔

"وہاں بیٹھک میں کیا ہو گا بیٹے!"

"وہاں سے ضلع مجسٹریٹ کے پاس چلیں گے اور "شانتی سبھا" کے لیے اجازت مانگیں گے۔ پھر وقت طے کر لیں گے"۔

"یہ تو بہت اچھا کام ہو گا۔ بیٹے تمہارے آجانے سے لگتا ہے کہ ماحول ضرور اچھا ہو جائے گا"۔

"انکل ایسا کچھ نہیں ہے۔بس انسان کو اچھے کام کے لیے ہمیشہ کوشش کرتے رہنا چاہیے، کامیابی تو اللہ کے ہاتھ ہے"۔

"ٹھیک ہے تم لوگ ناشتہ کر لو جب تک میں دو تین لوگوں کو بلا لیتا ہوں، پھر ایک ہی ساتھ یہاں سے حاجی صاحب کی کوٹھی پر چلیں گے"۔

۱۸
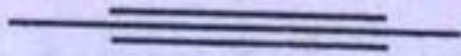
حاجی سلیمان صاحب کی کوٹھی بہت بڑی تھی۔انھوں نے اپنی دولت کی رکھوالی کے لیے کتّے نہیں پال رکھے تھے۔ایک تو انھیں اس حدیث پاک کا لحاظ تھا کہ جس گھر میں تصویر ہوتی ہے یا کتّا ہوتا ہے اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔اس کے علاوہ انھیں آج کے "کتّا کلچر" سے بے حد نفرت تھی۔پھر یہ کہ جب کتّا پاگل ہو جاتا ہے تو کب کس کو کاٹ کھائے کیا پتہ۔اس لیے ان کا ماننا تھا کہ "ہمیں کیا پاگل کتّے نے کاٹا ہے کہ کتّا پالیں"۔ان کا ماننا یہ بھی تھا کہ دولت کی حفاظت آدمی نہیں کر سکتا تو کتّا کیا کرے گا۔

ساڑھے دس بجے تک حاجی صاحب کی کوٹھی پر سارے لوگ جمع ہوگئے۔ دونوں فرقوں سے پانچ پانچ لوگوں کا انتخاب ہوا۔ضلع مجسٹریٹ سے ملاقات کے لیے رضوان اور ظفر بھی فہرست میں شامل کیے گئے۔اس گہما گہمی سے لوگوں میں کچھ جوش و خروش کا ماحول پیدا ہوا تھا۔جہاں تہاں تبصرے بھی ہو رہے تھے۔ ضلع مجسٹریٹ رضوان کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ یہ طے ہوا کہ آج ہی ساڑھے چار بجے شام گاندھی میدان میں "شانتی سبھا" منعقد ہوگی جس میں شہر کے سارے لوگ جمع ہوں گے۔ضلع

مجسٹریٹ نے اس اقدام سے خوش ہو کر ”شانتی سبھا“ کی ساری ذمہ داری خود ہی لے لی۔ وہاں تقریر کرنے کے لیے دو دو لوگوں کو دونوں فرقوں سے منتخب کیا گیا۔ اس کے علاوہ علاقے کے ایم ایل اے بھی مقرروں میں شامل کیے گئے۔ ضلع مجسٹریٹ نے فوراً تیاری شروع کر دی اور اپنے ماتحتوں کو بلا کر میٹنگ کی۔ اس کے بعد پورے شہر میں لاؤڈ اسپیکر سے اس ”شانتی سبھا“ کا اعلان کروا دیا گیا۔

ضلع مجسٹریٹ سے مل کر آتے ہوئے کھانے کا وقت بھی ہو گیا تھا۔ وید ناتھ جی نے حاجی صاحب سے بہت کہا کہ دونوں کو میرے ساتھ جانے دیجیے وہاں راجیش کھانے پر انتظار کر رہا ہوگا۔ مگر حاجی صاحب نے کہا......

”کل سے تو آپ کے ساتھ ہی کھا رہے تھے۔ ایک وقت کی خدمت کا موقع مجھے بھی دیجیے۔ کیا آپ کے مہمان میرے مہمان نہیں ہو سکتے؟ میں تو کہوں گا کہ آپ بھی چلیے۔!“

وید ناتھ جی نے معذرت چاہتے ہوئے کہا...... ”اچھا پھر کبھی“!

حاجی صاحب کی باتوں سے وہ لاجواب ہو گئے ایسے بھی پورا شہر حاجی صاحب کی بے حد عزت کیا کرتا تھا۔

کھانے کے بعد حاجی صاحب کے گھر پر ہی ظہر کی نماز ادا کی گئی۔ کیوں کہ مسجد میں جماعت کا وقت نکل گیا تھا۔ نماز کے بعد رضوان اور ظفر وید ناتھ جی کے گھر چل پڑے۔ ادھر ضلع مجسٹریٹ نے گاندھی میدان میں رسمی طور پر ایک ڈائس بنوا دیا۔ ڈائس تو بنا ہوا تھا وہاں صرف چند کرسیاں رکھوا کر آگے سے گھیرا ڈلوا دیا گیا۔ ڈائس پر ایک بینر لگا دیا گیا جس پر لکھا

تھا...... "ہندو مسلم ایکتا" مائک والے کو بلوا کر چاروں طرف اسپیکر لگوادیے گئے ۔ ضلع مجسٹریٹ کی خواہش تھی کہ یہ روز روز کا فساد اور روز روز کا کرفیو ختم ہو، تاکہ وہ بھی اطمینان کا سانس لے ۔ بے چارے کی رات کی نیند اور دن کا چین لٹ گیا تھا ۔ پورے ضلع کو سنبھالنا کوئی کھیل نہ تھا ۔ یہ بھی خوف رہتا ہے کہ نہ معلوم کس معمولی سی غلطی پر اعلاکمان سے ٹرانسفر کا پروانہ آجائے ۔ یہ رہنما خوب جانتے ہیں کہ فساد کس طرح ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے، مگر یہی رہنما عوام کی ہمدردی بٹورنے کے لیے افسروں کو فون پر بھدّی گالیاں بھی دیتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ کھدر دھاری کسی کے نوکر نہیں ہوتے ، دوسرے لوگ یا تو ان کے نوکر ہوتے ہیں یا ان کی معصوم جنتا۔

رضوان اور ظفر راستے میں کچھ باتیں بھی کرتے جارہے تھے ۔ ظفر نے کہا...... "یار تم نے کیا لفڑا کھڑا کردیا؟"

"کیوں کیا ہوا...... ؟" رضوان نے بے دلی سے کہا۔

"اس جلسے کا مطلب ہے آج بھی ہم لوگ گھر نہیں جاسکتے۔ "شانتی سبھا" میں سات آٹھ تو بج ہی جائیں گے ۔!"

"کوشش کریں گے کہ رات کی ٹرین سے روانہ ہو جائیں اور اگر ممکن نہ بھی ہوسکا تو صبح کی پہلی گاڑی سے چلیں گے"۔

"یار وہاں دکان پر اکیلا لپّو ہے وہاں رہنا ضروری ہوتا ہے۔ تم تو مہمان کی طرح گھر آتے ہو، تمھارا کیا۔ ؟"

"دیکھو بہت پریشان مت ہو ۔ دیر ہوئی تو لپّو کو بیر گنیا فون پر بتادیں گے کہ ہم لوگ صبح آسکیں گے "۔

"ایسا کرو مجھے جانے دو، آخر میں یہاں رہ کر کیا کروں گا؟"

"تمھارا رہنا بہت ضروری ہے ۔اب تمھاری ضرورت آن پڑی ہے تو بھاگ رہے ہو۔ گھر سے باہر تم دوروز نہیں ٹِک سکتے، سالا پورا ہوم سِک ہے"۔

"لیکن، اس شانتی سبھا میں میرا کیا کام ہو سکتا ہے ؟"

"بس یہی کہ اس موقع پر ایک ایسا گیت سنا دینا جو ہندو مسلم اتحاد پر مبنی ہو۔ تم اپنی ڈائری تو لائے ہو گے؟"

"ہاں ڈائری تو ہے مگر اس میں کوئی خاص چیز نہیں ہے"

"کیسے نہیں ہے ۔میں نے کئی ایسے گیت لکھ کر تمہیں دیے تھے۔ ڈھاکہ میں اور دوسری جگہوں پر تم نے وہ گیت سنائے بھی تھے۔"

"اچھا، چلو ڈائری دیکھ کر بتا دینا کہ کون سی چیز وہاں پڑھی جاسکتی ہے"۔

باتوں باتوں میں دونوں وید ناتھ جی کے گھر تک آگئے۔۔ راجیش باہر ہی بیٹھا تھا......

"یار میں نے تم دونوں کا انتجار کر کے ابھی کھانا کھایا ہے۔ پتا جی نے بتایا کہ تم لوگوں کو حاجی صاحب کھانے پر لے گئے۔ وہاں تو کھوب مرگا مسلّم چلا ہو گا"۔

"نہیں راجیش سب سادہ سودی تھا"۔ ظفر نے مایوسی کے ساتھ کہا۔

"انکل کہاں گئے ؟" رضوان نے دریافت کیا۔

"ابھی آتے ہیں۔یہاں سے کتنے بجے گاندھی میدان چلیں گے ؟"

"بس ایک گھنٹے کے بعد چل دینا پڑے گا۔ وہاں پروگرام

بھی سِٹ کرنا کرانا ہو گا۔"

رضوان نے وضاحت کی۔

"جفر وہاں کچھ سنائے گا کہ نہیں ؟"

راجیش نے جاننا چاہا۔ رضوان کو یاد آگیا کہ ظفر کے لیے گیت بھی منتخب کرنا ہے۔ اس نے ظفر سے کہا......

"ظفر تم ذرا اپنی ڈائری نکالو......"

ظفر نے اپنے بیگ سے ڈائری نکال کر رضوان کے حوالے کردی۔ رضوان نے ڈائری کے صفحات الٹ پلٹ کیے اور پھر ایک صفحے پر رک کر کہا......

"یہ ......ہاں دیکھو یہ کتنی اچھی چیز ہے"۔

"کون سی ......یہ، یہ تو بہت پرانی ہے"۔

"تو نئی کہاں سے پیدا ہو گی۔ چیز پرانی ہے مگر یہاں کے لیے بالکل نئی ہے ۔دوسرے یہ کہ موقع کی مناسبت سے بہت اچھی چیز ہے"۔

"ٹھیک سے دیکھ لو، کچھ کم بیش کرنا ہو تو کردو"

"ہاں میں دیکھ لیتا ہوں۔اس میں سے چار پانچ بند سنا دینا"

"نشان لگادو"

رضوان نے قلم سے اپنے لکھے ہوئے پرانے گیت میں جہاں تہاں کچھ ردو بدل کیا اور نشان لگا کر ڈائری ظفر کے حوالے کردی۔ ظفر اپنی ڈائری لے کر کمرے کے اندر چلا گیا اور اپنی کسی مخصوص دھن میں گنگنانے لگا۔

۱۹

وسیع و عریض گاندھی میدان، لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا۔ جیسے کوئی بڑا جشن ہو یا پھر کسی فلم اسٹار کی آمد۔ کیا یہاں جمع ہوئے سارے لوگ امن و سلامتی کے پرستار تھے۔ کیا یہ سب لوگ اسی شہر کے تھے۔ کیا ان کی دلی آرزو تھی کہ فساد اور کشیدگی کا ماحول ختم ہو جائے۔ اگر یہ سب لوگ ایسا ہی چاہتے تھے. تو پھر یہ فساد کا ماحول پیدا کیسے ہوا؟ کیا یہ جلسہ ان کے دلوں پر لگے میل کچیل صاف کرنے کی غرض سے منعقد ہوا تھا۔ لیکن اس جلسے میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو صرف یہ دیکھنے آئے ہوں گے کہ یہاں ہوتا کیا ہے۔ کبھی کبھی بے مقصد آمد بھی با مقصد ہو جاتی ہے۔ مگر ایسے لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتا کہ واپسی پر ان کے دل و دماغ میں ایک طرح کی تبدیلی کیسے پیدا ہو گئی۔ اس اعتبار سے اس "شانتی سبھا" کی بڑی معنویت تھی۔

جلسہ گاہ کے چاروں طرف سخت پہرہ تھا۔ پولس والے مستقل گشت کر رہے تھے۔ جگہ جگہ "ہندو مسلم ایکتا" کے بینرز لگے ہوئے تھے۔ اب کسی کی آواز مائیکروفون پر ابھری......

"بھائیو اور بہنو! آج کی یہ سبھا ایک یادگار سبھا ہے۔ ہم سب یہاں اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ اپنے دلوں میں

کھڑی نفرت کی دیوار کو گرادیں۔ آیئے سب سے پہلے
اسکولی بچوں سے پرارتھنا سنتے ہیں۔"

دو بچیاں دو بچے اسکولی ڈریس میں مائک کے سامنے آئے۔ ان کے چہرے پر معصومیت اور دہشت ناک مستقبل کے آثار تھے۔ ان کے قد کو دیکھتے ہوئے مائک کو اور نیچے کیا گیا۔ پرارتھنا شروع ہوئی۔

इतनी शक्ति हमे देना दाता
मन का विश्वास कमज़ोर होना

پرارتھنا ہو رہی تھی تو لگ رہا تھا جیسے فضا ساکت ہے اور سب کو اپنے گناہوں اور کالے کرتوتوں کا احساس ہوگیا ہے۔ سب کے سب جیسے اس گاندھی میدان میں سر بہ سجود ہوکر اپنے گناہوں پر ندامت کے آنسو بہا لینا چاہتے ہیں۔ نہ معلوم ان معصوم بچے بچیوں کی ادائیں متاثر کر رہی تھیں یا پھر اس اذیت ناک ماحول میں پرارتھنا کے بول زخموں پر پھائے کا کام کر رہے تھے۔ دلوں کو ایک طرح کی طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ پرارتھنا کے بعد اسکولی بچیاں اور بچے ایک طرف بیٹھ گئے۔ ناظم جلسہ کی آواز بلند ہوئی۔

"اب ہم سب سے پہلے اپنے پیارے نیتا رام بالک جی کو
آمنترت کرتے ہیں کہ یہاں آکر دو شبد کہیں۔"

رام بالک جی اٹھے تو ان کے دس بیس چمچوں نے نعرہ بلند کیا......

"رام بالک جی ......زندہ باد"

"رام بالک جی ......زندہ باد"

"جب تک سورج چاند رہے گا...... رام بالک جی کا نام
رہے گا۔"

رام بالک جی مسکراتے ہوئے اٹھے۔ایک ہاتھ سے اپنی دھوتی سمیٹے ہوئے مائیک تک آئے۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر جنتا کو پرنام کیا۔ ڈائس پر بیٹھے کچھ لوگ کانا پھوسی بھی کر رہے تھے۔ تقریر کرنے والے کم تھے مگر ان کے امچے چمچے بہت تھے۔ایم ایل اے صاحب نے جب اپنی تقریر ختم کی تو ناظم جلسہ نے ظفر کا نام پکارا......

"بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج ہمارے بیچ ایک اچھے کلاکار ظفر صاحب موجود ہیں۔وہ آپ کو ایک پریم اور سدبھاؤ سے بھرا گیت سنائیں گے۔آیئے ظفر صاحب!"

ظفر مائک پر آیا......

"دوستو! آج اس شانتی سبھا کے لیے ایک گیت سنا رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس گیت میں ہم سب کے دلوں کی آواز موجود ہے۔ آپ انوبھو کریں گے......"

محبت کا نغمہ سبھوں کو سنائیں

دلوں میں جو نفرت ہے مل کر مٹائیں

ظفر نے جب گیت ختم کیا تو فضا میں تالیوں کی گڑگڑاہٹیں گونج اٹھیں۔ اب رضوان کو اپنی بات اور جذبات رکھنے کی دعوت دی گئی۔رضوان نے مائک پر آکر اپنی تقریر شروع کی:

"دوستو! میں کوئی لمبا چوڑا بھاشن دینے نہیں آیا ہوں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ہم سب اپنے دلوں سے نفرت کی بھاؤنا کو ختم کردیں۔ آج ہم جس ماحول میں جی رہے ہیں وہ جہنم سے کم نہیں۔ گھروں کو جلایا رہا ہے، بے گناہ بچوں اور عورتوں کو مارا جارہا ہے۔آخر اس سے کس کو

کیا مل رہا ہے ...... کچھ بھی نہیں ...... کچھ بھی نہیں......
دراصل دنگائی باہر نہیں ہمارے دل میں ہے۔ہر آدمی
اپنے اندر کے دنگائی کو مار دے۔ایسا کرنے سے ہی
ہماری روح اور انتر آتماپاک ہوگی...... (تالیاں بجتی
ہیں) لمحے بھر کا توقف۔

"دوستو !اگر اس سماج کو بچانا ہے، ہندوستان کو بچانا ہے
اور سب سے بڑھ کر اگر اپنی بہو بیٹیوں کی حفاظت کرنی
ہے تو ہمیں اپنی سوچ کی حفاظت کرنی ہوگی۔ حملہ ہماری
سوچ پر ہو رہا ہے۔اپنی آنکھوں پر لگی نفرت کی پٹی کو
نوچ پھینکنا ہوگا تبھی آپ اس گھناونے منظر کو دیکھ سکتے
ہیں۔آیئے ہم اس گاندھی میدان میں قسم کھائیں کہ
نیتاؤں اور موقع پرست مذہبی رہنماؤں کے جھانسے میں
آکر ہم ایک دوسرے کا خون نہیں بہائیں گے۔ آیئے
ابھی وقت ہے، سیاست اور مذہب کے کھیل میں
انسانیت کو قتل ہونے سے بچالیں۔"

رضوان اپنے جذبات دکھ بھرے انداز میں بہت ہی روانی سے پیش
کررہا تھا۔اسی درمیان جلسہ گاہ کے ایک کونے میں چہ میگوئیاں شروع
ہوگئیں۔ زور زور کی آوازیں آنے لگیں۔ دیکھا گیا کہ ہاتھاپائی ہو رہی
ہے۔کئی لوگ کئی دوسروں کو مار رہے ہیں ۔شاید وہاں لگے "ہندو مسلم
ایکتا" کے بینر کو کسی نے نوچنے کی کوشش کی تھی۔پورے مجمع میں ہلچل سی
مچ گئی۔ پولس کنارے کنارے ڈنڈا گھماتی رہی ۔کچھ پولس والے مجمع سے
دور جاکر پیشاب کرنے لگے ۔ مجمع میں بھگدڑ کی سی صورت پیدا ہو رہی
تھی۔ رضوان نے مائک پر چلا چلا کر کہنا شروع کیا......

”شانت ہو جایئے ...... آپ لوگ بیٹھ جایئے، بیٹھ جایئے
پلیز! بینر اکھڑ جانے سے کیا ہوگا ؟ پلیز آپ لوگ بیٹھ
جایئے......“۔

دھیرے دھیرے کچھ لوگ جانے لگے اور کچھ لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھنے لگے۔رضوان نے اپنی تقریر کا بقیہ حصہ شروع کیا۔

”ہاں تو دوستو! میں یہ کہہ رہا تھا......

اسی درمیان ڈائس کے پاس ایک بم پھٹ گیا۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے وہاں دو تین لاشیں نظر آنے لگیں۔بھگدڑ مچ گئی۔ایم ایل اے صاحب مجمع میں جب جھگڑا شروع ہوا تھا اسی وقت پیشاب کرنے کے بہانے نکل چکے تھے۔شاید انھیں اس جھگڑے کا آخری سرا بھی معلوم رہا ہو۔ درجنوں لوگ شدید زخمی ہوگئے۔ دو تین اسکولی بچے بھی زخمی ہوگئے۔ سارے زخمیوں کو ضلع اسپتال بھیج دیا گیا۔ جن کی حالت زیادہ نازک تھی انھیں ایمبولینس سے پٹنہ اسپتال بھیج دیا گیا۔رضوان بھی شدید زخمی تھا اور پوری طرح بیہوش تھا۔ظفر کو معمولی زخم لگا تھا اس لیے وہ رضوان کے ساتھ ساتھ رہا۔ ویدناتھ جی بھی بُری طرح زخمی ہوئے تھے۔انھیں بھی پٹنہ بھیج دیا گیا۔ پٹنہ اسپتال میں جب رضوان کو ہوش نہیں آیا تو ابو بکر رضوی پروفیسر صابر علی، پرویز اور ثاقب وغیرہ اسے حیٔ کلنک لے کر آگئے۔پروفیسر صابر علی کو ظفر نے فون کر دیا تھا۔ساتھ ہی گھر بھی فون پر خبر دے دی گئی تھی۔

رضوان پورے دو روز تک بیہوش رہا۔دوسرے سارے زخمی ہوش میں آچکے تھے۔ویدناتھ جی پٹنہ اسپتال میں تھے۔ان کی دیکھ ریکھ راجیش کر رہا تھا۔

آہستگی سے رضوان کے ہونٹ ہلے۔وہاں موجود رشتہ داروں اور دوستوں میں امید کی ایک کرن پھوٹی ...... آواز آئی جیسے کمرے میں کانا پھوسی ہورہی ہو ......"یا اللہ" ......"یااللہ" "ماشاء اللہ......" دیکھو ہوش آرہاہے"وغیرہ وغیرہ۔ رضوان نے اپنی چپچپی ہوئی زبان اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر پھیری۔ ظفر نے پانی سے روئی بھگوکر زبان اور ہونٹ تر کرنے کی کوشش کی۔اس نازک حالت میں گلاس یا چمچے سے پانی پلانا مناسب نہیں ہوتا۔اب اس کے ہاتھوں اور پیروں کو حرکت ہوئی۔دونوں پلکیں پھڑکنے لگیں۔وہاں کمرے میں "اللہ اللہ" کاورد بڑھ گیا۔جیسے سب کے سب رضوان کی زندگی پہلے کی طرح تازہ دیکھنے کے آرزومند ہوں۔

اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ سامنے احباب اور رشتہ داروں کی دھندلی تصویریں موجود تھیں۔زیبا کی آنکھوں نے رضوان کی آنکھوں سے وعدہ کیا کہ اب تم تنہا نہیں ہو بلکہ ہم بھی تمھاری تحریک میں شامل ہیں۔وہاں موجود ہر ایک کورضوان سے آنکھیں ملاتے ہوئے شرمندگی کا احساس ہورہا تھا۔اس کی آنکھیں پروفیسر صابر علی کی آنکھوں سے متصادم تھیں جیسے کہہ رہی ہوں ......

"انکل ! اس دیش کو اور انسانوں کو نظریہ سازی نے تباہ کر دیا۔ کاش آپ جیسے لوگ ڈرائنگ روم سے باہر نکل کر میدان عمل میں قدم رکھتے۔ کاش ہندوستان کے بیمار ذہن کا مداوا تلاش کرتے۔ کاش آپ سوچ سکتے......"

شاید پروفیسر صابر علی نے رضوان کی آنکھوں کو پڑھ لیا تبھی تو ان کی بوڑھی مگر چمکتی ہوئی آنکھیں رضوان کی بے نور آنکھوں سے لجا کر جھک گئیں۔

اب رضوان کے جسم میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔ پھر حرکت سی ہونے لگی۔ حرکت دھیرے دھیرے کچھ تیز ہوئی۔ الٹ پلٹ ہونے سے اس کا منہ تکیے میں چلا گیا۔ اوندھے منہ پڑا ہاتھ پیر ہلاتا رہا اور کچھ بڑبڑاتا رہا۔ اس وقت ایک لفظ اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ آدھا ٹکڑا تکیے میں گھس گیا اور آدھا ٹکڑا لرزتا ہوا فضاؤں میں کہیں گم ہو گیا۔ شاید دونوں ٹکڑوں کو ملانے پر لفظ "ک۔ و۔ ن یعنی "کون" بنتا تھا؟......

کچھ دوستوں نے "رضوان رضوان" کہہ کر اسے پکارا۔ کیا پتہ رضوان منوں مٹی کے اندر تھا یا آواز دینے والے کسی بند غار سے آواز دے رہے تھے۔ رضوان پر کسی آواز کا کچھ اثر نہ ہوا۔

اب اس کی زبان سے رہ رہ کر کچھ فقرے اور جملے ادا ہو رہے تھے۔ کبھی ادھ کٹا جملہ، کبھی ایک لفظ، کبھی صرف سوں ساں جیسے کوئی شخص گہرے خواب میں بڑبڑاتا ہو۔ اس کے جسم میں مستقل حرکت ہو رہی تھی۔ پرویز دوڑ کر ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا۔ ڈاکٹر حیؔ آپریشن تھیئڑ میں تھے۔ ایک جونیئر ڈاکٹر آکر معائنہ کر گیا۔ اس نے بتایا کہ گھبرانے کی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہوش آرہا ہے، آپ لوگ اطمینان رکھیں۔ آپریشن کے بعد ڈاکٹر صاحب خود دیکھ بھی لیں گے۔ سب کو قدرے اطمینان ہوا۔ جسم اور ہاتھ

کوثر مظہری ۱۹۶۴ء میں مشرقی چمپارن بہار کی ایک مشہور بستی چندن بارہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۸۴ء میں علم نباتات میں گریجویشن کرنے کے بعد دو برسوں تک بہ وجوہ تعلیمی سلسلہ منقطع رہا۔ ۱۹۸۷ء میں انھوں نے بہار یونیورسٹی مظفر پور سے اُردو آنرز کا امتحان دیا اور اول پوزیشن حاصل کی۔ کچھ دنوں پبلک سروس کمیشن کی تیاری کرتے رہے مگر افتادِ طبع اس کے منافی تھی۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی سے پروفیسر شمیم حنفی کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آجکل شعبۂ اردو جامعہ ملیہ میں استاد ہیں۔

مطبوعات:

جان چمن	: شاعری ۱۹۸۷ء
موج ادب	: تاریخ زبان و ادب ۱۹۹۱ء
شکستہ پر	: خلیل جبران کے ناول کا انگریزی سے ترجمہ ۱۹۹۷ء
عرش وطیبہ	: حمد و نعت کا مجموعہ ۱۹۹۸ء
پیار کی خوشبو	: شمس الحق عثمانی (کہانی NBT) ترجمہ ہندی میں ۱۹۹۸ء
بوڑھا فقیر	: محمد علیم (کہانی NBT) ترجمہ ہندی میں ۱۹۹۸ء
آنکھ جو سوچتی ہے	: ناول ۲۰۰۰ء

منتظر کتب:

جرات افکار	: تنقید
ضرب یتیم	: شعری مجموعہ
جدید اردو نظم	: تحقیق و تنقید

(تہذیب و ثقافت کے آئینے میں)

جواز ۸۰ اور بعد کی شاعری کا : ترتیب

"کچھ لوگ وہاں الاؤ کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے اور کچھ لوگ پھونک مار کر شعلہ بھڑکانے اور اپنی کھلی پنڈلیوں اور رانگوں کو سینکنے میں مصروف ہو گئے۔"

"سورج کی ضیا آج کچھ زیادہ سرخ ہو گئی تھی۔ ندی کے خون آلود پانی پر جب سورج کی کرنیں پڑی ہوں گی تو اس کا انعکاس ہوا ہوگا جس سے یہ نکیا اور بھی سرخ ہو گئی ہوگی۔ سورج جو سیتا مڑھی کی طرف سے طلوع ہوا تھا اور بتیا کی طرف مغرب میں اپنی سرخ کرنیں بکھیر رہا تھا، رضوان کا گھر دونوں کے درمیان میں واقع تھا۔۔۔"

(اسی ناول سے)